

سلاطین عالمی سٹارز

انٹرنیشنل
نئی دہلی

اُردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

فرانس میں اسلامی تہذیب کے احیاء سے دنیا حیرت زدہ

قیمت تین روپے



یہی ایش کون ہے؟
یروشلم میں حالیہ
بم دھماکوں کے پیچھے
اصل دماغ جس کے نام
سے اسرائیل اور امریکہ
کے حکام دھلے جاتے ہیں

اس شمارے میں
☆ اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں کے
خطرناک منصوبے۔
☆ حماس کی مقبولیت سے
عرفات، رابن، کنٹنن حواس
باختہ
☆ کنٹنن کے دورہ مغربی ایشیا کا
ایک جائزہ
☆ جنوبی افریقہ کا اسلاک کلچر امت
مسلمہ کے لئے امید کی کرن
☆ کیا مراقش کے قدیم یہودی
اسرائیل و عربوں کے درمیان
اہم کڑی بنیں گے۔
☆ آئیک نام نہاد مسلم صحافی کی
زہر افشائیاں
☆ کیا مغرب کا نظام دجال کا نظام
ہے؟
☆ مسلم ریزرویشن: غاصبوں سے
حق و انصاف کا مطالبہ؟
☆ کشمیر کی تازہ ترین صورتحال کا
بھرپور تجزیہ
اس کے علاوہ بہت سے اہم
موضوعات اور مستقل کالم

مغرب کی خدا بے زار تہذیب پر

اسلامی اسکارف کا مملہ

AUSTRALIA	AS\$ 3.50	DENMARK	D KR. 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ\$ 4.95	SRI LANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR 12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F MK 10.00	KOREA	W 1,800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	BS\$ 4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	CS\$ 3.50	HONG KONG	HK\$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	£ 1.30
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S\$ 2.50	U.S.A.	US \$ 3.00

سنگھریواری کے سایے میں پلنے والے رشدی سے بھی خطرناک

ایک نام نہاد اسلام صحافی کی زیر افشانی

تحریر: ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں

یہ بات قابل غور ہے کہ وکالت اور میڈیا کے میدان میں پٹا ہوا اور ناکام شخص آنے والے دنوں میں کس طرح ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ اسلام دشمنی آج ایک بہت مقبول حربہ بن چکا ہے اور ملکی اور غیر ملکی وسائل پر قابض طاقتوں کے پاس ٹکڑوں کی کمی نہیں جو وہ بوقت ضرورت بھوکوں کے سامنے پھینک سکیں۔

مضمون کے آخر میں طالب صاحب نے اپنے ارادوں کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے اور یہ کہ کر ہندوستانی مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس سے پہلے کہ انہیں بدلے پر مجبور کیا جائے بہتر یہ ہے کہ خود بدل جائیں "اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا وہ اپنی مرضی سے خود کو بدلتی ہوئی اقدار اور حالات کے مطابق ڈھالیں گے یا بنیادی حقائق کے دباؤ کے غلبے سے گزرنے کے بعد یہ راستہ اختیار کریں گے۔" معاملہ بالکل واضح ہے ہندوستانی مسلمانوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے منہ پھیر لیں۔ طالب صاحب لکھتے ہیں۔

"انہیں اپنے آپ سے اس ضمن میں یہ بنیادی سوال کرنا چاہیے کہ اسلام کے مقدس صحیفوں کو لافانی اطلاقیات کا حامل کس حد تک سمجھنا چاہئے۔ خصوصاً یہ کہ قرآن اور حدیث کو کس حد تک ہر زبان و مکان کے لئے موزوں اور حرف آخر سمجھا جاسکتا ہے؟ اس سوال کے اطمینان بخش حل کی تلاش میں ناکامی، زندگی میں تبدیلی کے آہنی قانون کے قبول کرنے میں اسلام کے تامل اور جھجک کی بہت بڑی وجہ ہے۔"

اس طرح رشید طالب صاحب کے خیال میں اصل ضرورت اس بات کی نہیں کہ ہم تعلیم حاصل کریں، اپنے مدارس کی جدید کاری کریں، نئے اسکول اور کالج کھولیں، نئی ٹکنالوجی سیکھیں اور ایجاد کریں،

اسلام کی ابدیت کا تصور جس سے طالب صاحب سر اسیم ہیں وہ اسلام کے لئے کوئی "معمہ" یا "مسئلہ" نہیں ہے۔ بلکہ اسی میں اسلام کی قوت مسلسل کاراز پنہاں ہے، اسلام کی ابدیت جس دن ختم ہو جائے گی وہی اسلام کی زندگی کا آخری دن بھی ہوگا۔ اسلام کا بادی پیغام آج بھی اہم ہے۔ یہ بیسویں صدی کے موڑ پر بھی انتہائی شاداب ہے جتنا کہ چودہ سو سال پہلے تھا۔

تجارت و معیشت کے میدان میں ترقی کریں، سماجی برائیوں کو دور کریں بلکہ ان کے خیال میں اصل مطلوب یہ ہے کہ حدیث کو جھٹلائیں اور قرآن کو ہر زمانے کے لئے خدا کی ہدایت کے مرتبے سے محروم کر کے اسلام کو یکسر مسترد کر دیں۔ ہمارا یہ عمل ان کے نزدیک ہم پر ترقی کے دروازے اسی طرح کھول دے گا (جیسے کہ اس نے البانیا کے مسلمانوں پر کھولا تھا۔ البانیا خود کو لادین قرار دینے والا دنیا کا واحد ملک تھا)۔

اسلام کی "ابدیت" کا تصور جس سے طالب صاحب سر اسیم ہیں وہ اسلام کے لئے کوئی "معمہ" یا "مسئلہ" نہیں ہے بلکہ اسی میں اسلام کی قوت مسلسل کاراز پنہاں ہے۔ اسلام کی ابدیت جس دن (باقی صفحہ 16)

دلوں پر دراصل اسلام کا سیاسی منشور کچے لگا رہا ہے۔ وہ دراصل اپنے آقاؤں کی آواز میں ہی آواز ملا رہے ہیں۔ ان باتوں کی ان کے نزدیک چنداں اہمیت نہیں ہے کہ تمام نظریات عالمی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ قوم پرستی کے نظریے کے قدم اکھڑے ہیں اور تیز تر ذرا لچ آبدورفت، مواصلات اور معلوماتی سہولیات و سہولتوں کے طفیل دنیا سمٹ کر ایک بڑا سا گول بنتی جا رہی ہے۔

جب پوری دنیا کے کمیونسٹ ماسکوں کی طرف دیکھتے تھے اور اب بیجنگ سے ہدایت و سرپرستی کی لو لگائے ہوئے ہیں، عیسائی روم اور کیتھولک رومنائی کے طالب ہیں۔ حقوق انسانی کے منادی گروہ مغربی طاقتوں سے اپنی قسمیں وابستہ کیے

اپنے قارئین کی معلومات کے لئے یہ بتا دوں کہ رشید طالب صاحب باریٹ لائے وکالت کے میدان میں شہرت و دولت کے حصول میں ناکام ہو کر صحافت کا رخ کیا اور کانگریس پارٹی میں اپنے زیر تعلقات کے طفیل میں گاہے گاہے ٹی وی پروگراموں میں بھی آنے لگے۔ اسلام کے کسی رکن کی ادائیگی غالباً آج تک ان سے سرزد نہیں ہوئی لیکن انہوں نے اپنے نام کا فائدہ اٹھا کر اسلام پر حملہ کر کے خود کو ایک "اچھے مسلمان" کی حیثیت سے ضرور پیش کر دیا ہے۔

ہوئے ہیں، تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے اور اگر انسانی حقوق کے لئے جہاد کرنے والوں اور لاتعداد غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کو مغربی اصحاب خیر اور "انسانیت" کے ہمدردوں کی شہرت ملتی ہے تو اس پر کوئی واویلا نہیں جتنا یہ ساری باتیں طالب صاحب کے تصور عالم میں ذرا سا بھی ارتعاش پیدا نہیں کرتیں۔ لیکن اسلامی وحدت و سالمیت کا دھندلا سا تصور بھی جسے فلسطین اور بوسنیا اور دوسرے بہت سے الم ناک ساحلوں کی آرائش میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، طالب صاحب کے لئے بہت پریشانی کا سبب بنا ہوا ہے۔ طالب صاحب نے بڑی جاں فشانی سے یہ انکشاف کیا ہے کہ سیاسی سطح پر اسلام جدید حقائق سے ہم آہنگ نہیں ہے، اس ناکامی کا سبب وہ اسلام کے تین بنیادی تصورات میں تلاش کرتے ہیں یعنی (الف) مقتدر اور ناقابل صلح توحید (ب)

نندیں اڑا رہی ہیں گذشتہ ایک صدی سے نو آبادیاتی غلبہ کی بناء پر عالم اسلام میں ان پر کہیں بھی عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔ نوآبادیاتی بیخود استبداد سے بچ رہنے والا واحد ملک سعودی عرب جرائم کے شرعی قوانین پر ہنوز کلابند ہے۔ اور آج امن و تحفظ کے اعتبار سے سعودی عرب کا نیو یارک، اسٹاک ہوم اور دہلی کی سڑکوں سے موازنہ کریں تو اسے جنت کنا بیجا نہ ہوگا۔

جناب رشید طالب ہماری معلومات میں یہ کہہ کر اضافہ کرتے ہیں کہ ہر "اچھا مسلمان" (جس سے یقیناً ان کا اشارہ خود اپنی ہی طرف ہے) اپنے عقیدے اور مذہب کو جدید زندگی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن موصوف ہمیں یہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں کہ یہ کام ہوگا کیسے اور ایسے اچھے مسلمانوں کے عقیدے کے کون سے عناصر ناپسندیدہ ہیں؟

غالباً رشید طالب صاحب نے جدید آسائشوں اور مشینوں کے استعمال کو غلطی سے اعتقادی جدید کاری سمجھ لیا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جدید ٹکنالوجی اور آلات کے استعمال سے کسی شخص کے عقیدے کا درجہ بلند یا پست نہیں ہوتا۔

رشید طالب صاحب اچھے مسلمانوں کے ذراتی سطح کے سلوک سے بذات خود مطمئن ہیں۔ لیکن جس چیز سے ان کا بلڈ پریشر بڑھتا ہے وہ ہے اسلام کے بنیاد پرست پروکار جو ان کے نزدیک "برے مسلمان" یا "معمولی مسلمان" ہیں یعنی ہم اور آپ جیسے مسلمان جو اجتماعی سطح پر اسلام کو مکمل عالمی نظام کی بنیاد تصور کرتے ہیں اس سے بڑھ کر ایک باضابطہ ریاستی نظریہ بھی سمجھتے ہیں۔ اور یہ بات نہ صرف رشید طالب جیسے فکر مند انسان کی نگاہ میں بلکہ مغرب اور غیر مسلم مشرق کی نظر میں ایسی ہے جو ایک نئی "شیطان ریاست" کا خوف ان پر طاری کر دیتی ہے۔

یوں بلی تھیلے سے باہر آگئی ہے، جناب رشید طالب اور ان کی قبیل کے دوسرے لوگوں کے

طالب صاحب کے مضمون کی ابتداء اس دعوے سے ہوتی ہے کہ اسلام کو چیلنجوں کا سامنا ہے (حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے، یعنی یہ کہ دوسرے اسلام سے خائف ہیں)۔ آگے چل کر وہ مسلمان اہل قلم کو یہ ترغیب دیتے ہیں کہ وہ داخلی افراد کی حیثیت سے اس کی تحقیق کریں کہ آج کی دنیا میں اسلام ہی کیوں ایسی مذہبی روایت بن کر رہ گیا ہے جو خود کو بدلنے اور نئی قدروں کے مطابق ڈھالنے سے منکر ہے۔ گویا کہ اسلام کو طالب صاحب کے لباس کی طرح "مصدقہ نئی قدروں" اور معیاروں پر پورا اترنا چاہئے۔ یہ "نئی قدروں" کیا ہیں؟ اور وہ مصدقہ مرتبہ کیسے پاتی ہیں؟ اس کی کوئی دلیل دینے سے طالب صاحب قاصر ہیں۔

اپنے قارئین کی معلومات کے لئے یہ بتا دوں کہ رشید طالب صاحب باریٹ لائے وکالت کے میدان میں شہرت و دولت کے حصول میں ناکام ہو کر صحافت کا رخ کیا اور کانگریس پارٹی میں اپنے زیر تعلقات کے طفیل میں گاہے گاہے ٹی وی پروگراموں میں بھی آنے لگے۔ اسلام کے کسی رکن کی ادائیگی غالباً آج تک ان سے سرزد نہیں ہوئی لیکن انہوں نے اپنے نام کا فائدہ اٹھا کر اسلام پر حملہ کر کے خود کو ایک "اچھے مسلمان" کی حیثیت سے ضرور پیش کر دیا ہے۔

اگلے پیرا گراف میں وہ کہتے ہیں کہ اسلام کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ انسانی حقوق کے تین پوری طرح تسلیم شدہ معاملات میں شدت پسندی برتتا ہے۔ وہ کون سے تین امور ہیں جن کا الہام رشید طالب پر ہوا ہے اور انہیں تسلیم کس نے کیا ہے؟ لگتا ہے رشید طالب نے حالیہ تسلیم شدہ "حقوق انسانی" یا امریکی نمونہ سن رکھا ہے۔ ان کے نزدیک یہ تین تسلیم شدہ امور ہیں: لبرل ڈیموکریسی، عورتوں کی حیثیت، اور ظالمانہ سزائیں۔ رشید طالب ہی یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں کہ یہ تینوں امور "پوری طرح تسلیم شدہ" کیسے ہو گئے اور انہیں تسلیم کرنے والے لوگ ہیں کون؟

یہ بات خاصی مشکوک ہے کہ مغربی ڈیموکریسی ہم سب کے لئے سازگار ہے۔ خود ہمارے ملک میں اور ایشیا اور افریقہ میں کہیں بھی

یہ بات قابل غور ہے کہ وکالت اور میڈیا کے میدان میں پٹا ہوا اور ناکام شخص آنے والے دنوں میں کس طرح ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ اسلام دشمنی آج ایک بہت مقبول حربہ بن چکا ہے اور ملکی اور غیر ملکی وسائل پر قابض طاقتوں کے پاس ٹکڑوں کی کمی نہیں ہے جو وہ بوقت ضرورت بھوکوں کے سامنے پھینک سکیں۔

سیاسی انتشار اسی درآمد شدہ نظریے کا نتیجہ ہے جو نہ ہماری تاریخ سے میل کھاتا ہے اور نہ ہی اقدار و مزاج سے عورتوں کی حیثیت کا قصہ چھیڑ کر رشید طالب ایڈوکیٹ نے ایک اور مذاق کیا ہے۔ اسلام پر عورتوں کی حق تلفی کا وہ الزام لگاتے ہیں لیکن اس پر نظر نہیں کہ ہر سال ان کے ہمسفروں کی ہزاروں بیٹیاں نذر آتش کر دی جاتی ہیں جسے ہندوستانی میڈیا "جسری موت" کے نام کا ملمع لگا کر پیش کرتا ہے۔ سٹی، دیو داسی اور رحم مادر میں غیر مزید اولاد کو ختم کر دینے کے قبیح اعمال اس پر مستزاد ہیں۔

رہی بات "ظالمانہ سزائیں" کی تو یہ بھی خوب لطیفہ ہے۔ ان کے مغربی احباب جن نرم سزائوں کی حمایت کرتے ہیں اس کی نتیجے میں دنیا آج تباہی

ہمیں اس کی خبر نہیں کہ سلمان رشدی، بامی مسجد اور ابھی حال میں تسلیم نسرین کے سطحی مسائل میں الجھ کر ہم ان سے کہیں زیادہ سنگین واقعات کی طرف سے غافل ہیں جو ہمارے گرد و پیش آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ سنگھریواری کے جیسے اردن شوری برسوں تک اسلام پر حملے کرتے رہے اور کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کی ملمع کارانہ دانشوری کا پردہ فاش کرتا۔ ادھر کچھ دنوں سے ایک صاحب جو دین سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور نام ہی کے مسلمان ہیں اسلام پر کچھ اچھالنے کے اسی پرانے کھیل میں مصروف ہیں۔ ان کا تازہ ترین کارنامہ روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کی 23 اپریل 1994 کی اشاعت میں شامل ایک مضمون ہے۔ ہر چند کہ اس مضمون کی طرف میں خاصی دیر سے توجہ دے رہا ہوں لیکن یہ توجہ اب بھی ضروری ہے کیوں کہ جن خطرناک خیالات کی اشاعت صاحب مضمون کی طرف سے کی جا رہی ہے وہ عقربہ پر کشش سرورق کے ساتھ شائع ہونے والی علمی تصنیف کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

اپنے قارئین کی معلومات کے لئے میں بتا دوں کہ صاحب مضمون جناب رشید طالب بار ایٹ لائے وکالت کے میدان میں شہرت و دولت کے حصول میں ناکام ہو کر صحافت کا رخ کیا اور کانگریس پارٹی میں اپنے دیرینہ رسوخ کے طفیل میں گاہے گاہے ٹی وی وشن کے پروگراموں میں بھی آنے لگے۔ اسلام کے کسی رکن کی ادائیگی غالباً آج تک ان سے سرزد نہ ہوئی۔ لیکن انہوں نے اپنے نام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام پر حملے کر کے خود کو ایک طبقے کے سامنے "اچھے مسلمان" کی حیثیت سے ضرور پیش کر دیا۔ رشید صاحب جو اپنی عمر کے آخری حصہ کو بچھڑ رہے ہیں، لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے اور ارباب اقتدار کی نظروں میں سامنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ شاہ بانو کیس کے سلسلے میں ٹائمز آف انڈیا میں خط شائع کر کے مسلمانوں پر ہتھ

بھینکنے والے پہلے فرد بھی وہی تھے۔ سر دست وہ اس ملک کے ایک خود مختار ادارے کی پریس فیلوشپ پر فائز ہیں تاکہ ٹائمز آف انڈیا میں شائع اپنے مراسلے کے خطوط پر کوئی تصنیفی کارنامہ انجام دے سکیں۔

سنگھریواری (آر ایس ایس) کے سامنے میں پلنے والے کی ادیب اور صحافی وقتاً فوقتاً اس میدان میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ اور اب رشید طالب مسلم نام کے ذریعے ان کے خیالات کو مزید قابل یقین بنانے میں کوشاں ہیں۔ لیکن ان کی دانشوری جتنی سطحی اور علمیت جتنی مشکوک ہے اسی قدر اب امت میں بالغ نظری اور اعتماد پیدا ہو چکا ہے جس سے مسلمانوں کے درمیان قادیانیت جیسے کسی نئے شوشے کے بیٹنے کا امکان نہیں ہے۔

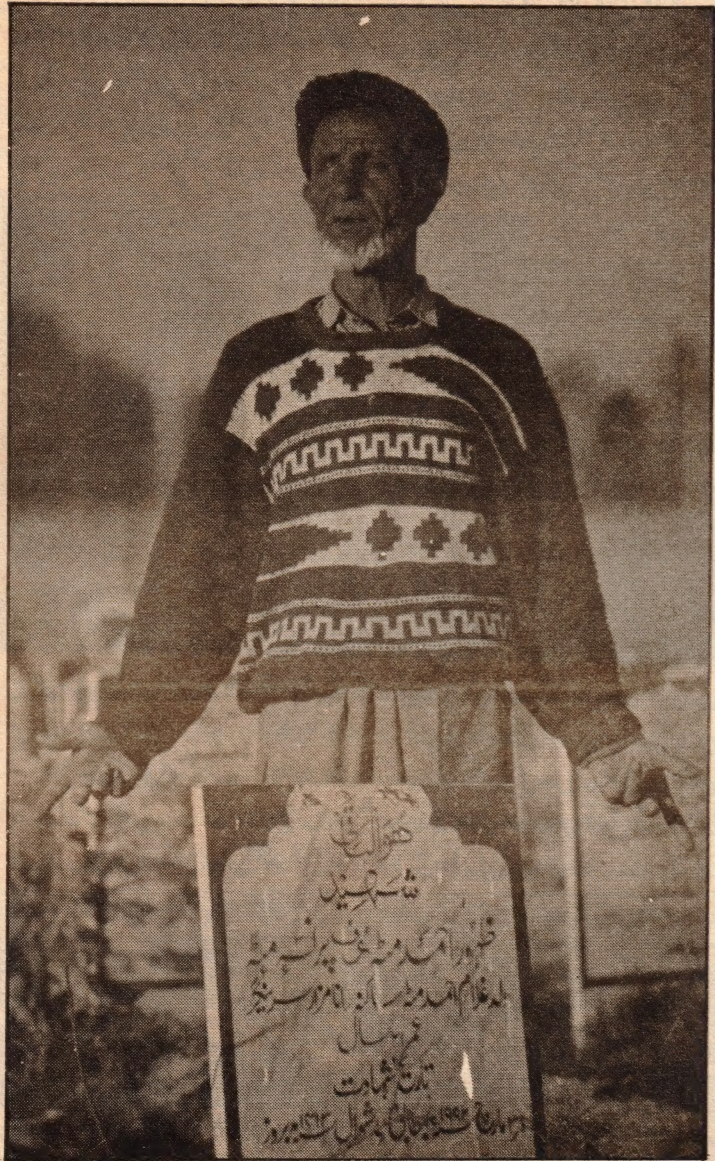
ہندوپاک اور اقوام متحدہ کی تشلیث کے مابین

مسلحہ کشمیری عوام

گزشتہ پانچ برسوں سے سنگینوں کے سامنے میں مسکتے کشمیری عوام کے لئے راحت کی کوئی کرن دور دور تک دکھائی نہیں دیتی، کیونکہ ہندوستانی فوج اور مسلح کشمیری حریت پسندوں کے درمیان دو پانوں میں پس رہے کشمیری عوام کی معاشی ابتری اور سیاسی بے چارگی و محرومی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ 1989 میں صدر راج کے نفاذ کے بعد سے ہی ریاست میں تمام سیاسی سرگرمیاں نہ صرف مہذب ہو کر رہ گئیں ہیں بلکہ دونوں ہی جانب سے "بندوق کلچر" کی سرگرمیاں حاوی ہوتی گئیں نتیجے میں مسئلہ کشمیر کی بجائے مزید الجھا چلا گیا۔ مسلح افواج اور "مجاہدین" کے درمیان جاری جنگ میں اب تک سیکڑوں معصوم جانیں تلف ہو چکی ہیں اور لاتعداد افراد جیل کی سلاخوں میں مقید انسانی حقوق سے محروم گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہیں۔

گو اس وقت دہلی کے سیاسی ایوانوں میں کشمیری انتخابات کرانے سے متعلق سرگوشیاں اور اس مسئلے پر اختلافات و اتفاقات کا بارگاہ ہے لیکن ریاست میں جمہوری حقوق کی بحالی اور سیاسی سرگرمیوں کے آغاز کے امکانات اتنے روشن نظر نہیں آ رہے ہیں جتنا کہ بظاہر میڈیا اور دہلی کے

تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مفتی محمد سعید کا کانگریس میں داخلہ کانگریس کے لیے کتنا مفید ثابت ہوگا اور اسی پر منحصر کرے گا مفتی محمد سعید کا



ایک جوان سال شہید کی قبر پر اس کا فریادی باپ

مستقبل کیونکہ فاروق عبداللہ ہوں یا مفتی محمد سعید اس وقت کشمیری عوام میں ان کی کوئی ملکہ نہیں ہے۔ ان تمام روایتی اور خاندانی سیاست دانوں کی مرکزی حکومت اور کابینہ میں کشمیر میں انتخابات کے سوال پر زبردست اختلافات ہیں اور خود حکومت اس سلسلے میں کوئی واضح پالیسی وضع کرنے میں ناکام ہے اس کی تصدیق وزیراعظم کے ذریعے کشمیر سے متعلق امور کو اپنی تحویل میں لینے کے عمل سے ہو جاتی ہے۔ لازم ہے کہ مرکزی حکومت کشمیری عوام کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ایسی پالیسی وضع کرے جن سے امن و امان قائم ہو سکے۔

انکار کردی تو کیا ایسی منجہ حکومت اس حکومت سے مختلف ہوگی جو صدر راج کی صورت میں جموں و کشمیر میں 1989 سے قائم ہے اور اگر مختلف نہیں ہوگی تو ایسے انتخابات اور سیاسی عمل کا کیا کوئی

گو اس وقت دہلی کے سیاسی ایوانوں میں کشمیری انتخابات کرانے سے متعلق سرگوشیاں اور اس مسئلے پر اختلافات و اتفاقات کا بارگاہ گرم ہے لیکن ریاست میں جمہوری حقوق کی بحالی اور سیاسی سرگرمیوں کے آغاز کے امکانات محدود ہو چکے ہیں۔ جو لوگ کشمیر کی صورت حال سے واقف ہیں ان کے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ مرکزی حکومت کی جانب سے انتخابات کرانے کے اعادہ کے باوجود ریاست میں امن کے

سیاسی حلقوں کی جانب سے پیش کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ جو لوگ کشمیری صورت حال سے واقف ہیں ان کے لئے اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ مرکزی حکومت کی جانب سے انتخابات کرانے کے اعادہ کے باوجود ریاست میں امن کے قیام کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ کل جماعتی تحریک حریت اور دیگر تنظیموں سے وابستہ سرکردہ رہنماؤں کی جیل سے رہائی کی بعد بھی عوامی سطح پر انتخابات کے لئے کوئی جوش یا امنگ دور دور تک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ خود جیل سے رہا کردہ کشمیری حریت پسند رہنما بھی ہندوستانی آئین کے تحت کرائے جانے والے انتخابات میں شرکت کو یکسر خارج از امکان قرار دیتے ہوئے اقوام متحدہ کے ذریعہ انتخابات کرانے اور اس کے نتیجے کو استصواب رائے تصور کرنے کے موقف پر سختی سے اڑے ہوئے ہیں۔ عبدالغنی لون اور گیلانی سے لے کر یسین ملک اور شیر شاہ تک سبھوں نے انتخابات کے سلسلے میں یکساں موقف اختیار کر رکھا ہے۔

لہذا اب مرکزی حکومت کی ساری امیدیں فاروق عبداللہ اور ان کی پارٹی نیشنل کانفرنس سے وابستہ ہیں، گو فاروق عبداللہ نے بھی شروع میں انتخابات میں شرکت کے لئے یہ شرط رکھی تھی کہ حکومت جب تک جموں کشمیر کو وہ محروم خود مختاری جو اسے 1952 تک حاصل تھی واپس نہیں دے

مطلب رہ جائے گا؟ مبصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی جانب سے کشمیر میں انتخابات کرانے کے شور و غوغائے کے پیچھے اصل محرک ان دنوں نیویارک میں اقوام متحدہ کے جاری اجلاس میں پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک کے ذریعے مسئلہ کشمیر پر پیش کیا جانے والا قرار داد ہے جس میں اقوام متحدہ سے مسئلہ کشمیر پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ثالثی کا مطالبہ شامل ہے۔ ہندوستان کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر اسلامی ممالک کے ذریعہ مسئلہ کشمیر پر مجوزہ قرار داد پیش کیا گیا اور اقوام متحدہ میں اس قرار داد کو حمایت مل گئی تو کشمیر کا مسئلہ بین الاقوامی مسئلہ بن جائے گا۔ جس سے ہندوستان کو شدید نقصان کا خطرہ لاحق ہوگا، علاوہ بریں انسانی حقوق کی پامالی اور سیاسی و جمہوری عمل کے انجماد کے مسئلے پر پاکستان اور دیگر بین الاقوامی انسانی حقوق کمیٹیوں کی جانب سے انکشت نمائی کے سبب عالمی برادری کے سامنے ہندوستان کو اس وقت جس مدافعت صورت حال کا سامنا ہے۔ انتخابی عمل کے آغاز سے اس کا تدارک کرنے میں ہندوستان کو آسانی ہوگی۔

مسئلہ کشمیر سے متعلق کسی واضح پالیسی کے بغیر اس کے حل کے لئے کسی مثبت پیش رفت کی امید نہیں بندھتی۔ لہذا مسئلہ کشمیر کے خاطر خواہ حل کے لئے لازم ہے کہ مرکزی حکومت کشمیری عوام کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ایسی پالیسی وضع کرے جس سے صحیح معنوں میں کشمیر میں امن و امان کا قیام ممکن ہو سکے۔

سیاسی مبصرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ مرکزی حکومت اور اس کی کابینہ کے مابین بھی کشمیر میں انتخابات کرانے کے سبب زبردست اختلافات موجود ہیں۔ اور خود مرکزی حکومت اس سلسلے میں کوئی واضح پالیسی وضع کرنے میں ناکام ہے۔ اس خیال کی تصدیق مرکزی وزیر داخلہ مسٹر چوہان اور وزیر مملکت برائے داخلی امور مسٹر راجیش پاتل کے مابین چپقلش اور اس چپقلش کے نتیجے میں وزیراعظم برہمراؤ کے ذریعے کشمیر سے متعلق امور کو خود اپنی تحویل میں لینے کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن مسئلہ کشمیر سے متعلق کسی واضح پالیسی کے

بغیر مسئلہ کشمیر کا ایک وزارت سے دوسری وزارت میں منتقلی محض سے کسی مثبت پیش رفت کی امید نہیں بندھتی۔ لازم ہے کہ مرکزی حکومت کشمیری عوام کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ایسی پالیسی وضع کرے جس سے صحیح معنوں میں کشمیر میں امن و امان کا قیام ممکن ہو سکے۔



الجزائر میں مسلم انقلابیوں سے مفاہمت کی کوشش

مراقش کے عوام اسے الجزائر کی دوسری جنگ کا نام دیتے ہیں۔ جنگ آزادی میں پانچ سے دس لاکھ افراد کی قربانی کے مقابلے میں دس یا بیس

امریکہ اور کسی قدر تاخیر سے فرانس متحارب گروہوں میں مفاہمت کی کوششوں کی ہمت افزائی کرتے رہے ہیں۔ ان کوششوں کی شروعات اسلامک سالیویشن فرنٹ کے دو لیڈروں عباسی مدنی اور علی بلجاجی کی حراست کو نظر بندی میں تبدیل کرنے اور ان کے دو ساتھیوں کی رہائی سے ہوئی ہے۔

بہر حال اس مسئلے کا کوئی آسان حل نظر نہیں آتا۔ قلیل مدتی یا فوری جمہوریت کے قیام کی کوشش کی گئی تھی جو 1922 میں ناکام ہو گئی۔ اس لئے بعد اسی شکل میں اس کا احیا کچھ مناسب نہ ہوگا۔ اسلامک سالیویشن فرنٹ کے (جسٹہ الاعتقاد الاسلامی) کے دو لیڈروں میں سے ایک علی بلجاجی انتہا کی نشوونما کی مذمت کرتے ہیں جس سے ان کی تحریک اقتدار میں آسکتی تھی لیکن وہ جمہوریت کو بڑا ہرنے والوں کی تعداد بہت ہی مختصر ہے۔ تاہم الجزائر کی موجودہ کشمکش میں فریقین کی جانب سے بڑھتی ہوئی خوریزی اور سفلی مستقبل کی خوفناک صورت حال کی غمازی کر رہی ہے۔ اس وقت مشرقی سدار کے کیمپوں میں تین ہزار اور ملک کے مختلف مقامات پر تیس سے پچاس ہزار افراد قیدی بنا کر رکھے گئے ہیں جہاں انہیں ہر روز اذیتیں دی جاتی ہیں۔ اسی کے شائد بشارت اسلامی طاقتیں الجزائر کے ممتاز دانشور طیتے کو اپنی دہشت گردی سے خائف کرنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ اب تک اٹھارہ صحافی اور اڑتالیس معلم قتل کئے جا چکے ہیں۔ ہر وہ شے یا فرد جسے غیر اسلامی قرار دے دیا جائے اسے موت کی دھمکیاں ملنے لگتی ہیں۔

الجزائر کے اس بحران کے حل کے لئے کسی حقیقی ابدائی امکان کا خیر مقدم یقیناً بڑی فراخ دلی سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کا راستہ مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ ملک میں ایسے شدت پسند عناصر موجود ہیں جو دونوں جانب کی قیادتوں کے درمیان کسی مصالحت کے تحت مخالف ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اعتدال پسند حلقے کو بالادستی حاصل بھی ہو گئی تو یہ بات یقین سے بہت پرے ہے کہ وہ مستقبل کے لیے کسی قابل قبول لائحہ عمل پر اظہار اتفاق بھرا ہوا ہے۔ ملک میں ایسے شدت پسند عناصر موجود ہیں جو دونوں جانب کی قیادتوں کے درمیان کسی مصالحت کے تحت مخالف ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اعتدال پسند حلقے کو بالادستی حاصل بھی ہو گئی تو یہ بات یقین سے بہت پرے ہے کہ وہ مستقبل کے لیے کسی قابل قبول لائحہ عمل پر اظہار اتفاق

پھر بھی اسلام کے لئے اجنبی اور نا آشنا تصور کرتے ہیں۔ اس صورت حال کا سب سے زیادہ حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ دونوں جانب کے اعتدال پسند افراد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ پوری طرح فہم مند نہیں ہو سکتے۔ اسلام پسندوں کی امید کے برخلاف فوج کی

یونینورٹی اساتذہ، وکلاء، ڈاکٹر، سرکاری افسران، ریائرڈ فوجی افسران اور چھوٹے بڑے بہت سے سیاستدان شامل ہیں۔ الارقم کی اپنی ایسی 48 سوسائٹیاں ہیں جہاں ان کی ضرورت کی ہر چیز میر ہوتی تھی۔ 250 سے زائد اسکول چلانے کے علاوہ الارقم کی تجارت 115 ملین امریکی ڈالر سے زیادہ کی ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اشعری محمد کو گرفتار کرنے کی وجہ سیاسی زیادہ اور مذہبی کم تھی۔ ان پر لگائے گئے

الارقم کے رہنما اشعری محمد نے مسیح موعود سے متعلق اپنے "عقائد" یا خیالات تبدیل کر لینے ہیں۔ ملیشیا کی سرپرست مذہبی کونسل کے سامنے 20 اکتوبر کو انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ مسیح سے متعلق ان کی تعلیمات غلط تھیں۔ محض یہ کہہ دینے کے بعد انہیں مسیحی عقیدہ قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد ملیشیا کی حکومت کے پاس انہیں جیل میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ گذشتہ اکتوبر کے آخری دنوں میں انہیں جیل سے رہا کر دیا گیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنے متبعین سے خطاب کرتے ہوئے اشعری محمد نے الارقم کو تحلیل کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ تنظیم کا خاص لباس یعنی سبز عبا پہننا چھوڑ دیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ الارقم عوامی فلاح و بہبود کے لئے ایک خطرہ تھی۔ لیکن انہوں نے ملی قوانین کے مطابق تنظیم کی تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کو کہا۔

الارقم کے تقریباً ایک لاکھ ملنے والے ملیشیا میں موجود ہیں۔ الارقم کے ممبر زیادہ تر ڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے بڑے لکھے لوگ ہیں جن میں

صفوں میں ابھی انتشار پیدا نہیں ہوا ہے۔ صرف مسلح اسلامی گروہ (آرڈ اسلامک گروپ) کا ہی یہ خیال ہے کہ اسلامی ریاست اگر قائم ہو سکتی ہے تو ہتھیار سے ہو سکتی ہے۔ اسلامک سالیویشن فرنٹ کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔ تاہم وہ زندگی کی ایسی حقیقت ہے جس سے نبرد آزما ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن فوج اخلاقی گراؤ کا شکار ہو رہی ہے۔ جوج کے سربراہ جنرل محمد لاماری کی قیادت میں صدر زیدوں اور ان کے مشیر قتل و غارتگری چلانے والوں پر حاوی ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جنرل لاماری کا خیال ہے کہ اسلامی دہشت گردوں کا صفایا کیا جاسکتا ہے۔

امریکہ اور کسی قدر تاخیر سے فرانس متحارب گروہوں میں مفاہمت کی کوششوں کی شروعات کرتے رہے ہیں۔ ان کوششوں کی شروعات

الجزائر کے مسلم انقلابیوں کے عہدے سے حکومت گھبراہٹ



قیادت کے انتخاب سے پہلے اسے ایک غیر جانب دار حکومت کی تشکیل کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ فوجی شدت پسند ان مطالبات کو خود ہتھیار ڈالنے کی آمادگی پر محمول کر رہے ہیں اور اب بھی مفاہمت کی بات کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ مسئلہ انتہائی واضح نہیں ہے۔ خصوصاً عباس

الارقم کے رہنما اشعری محمد نے مسیح موعود سے متعلق اپنے "عقائد" یا خیالات تبدیل کر لینے ہیں۔ ملیشیا کی سرپرست مذہبی کونسل کے سامنے 20 اکتوبر کو انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ مسیح سے متعلق ان کی تعلیمات غلط تھیں۔ محض یہ کہہ دینے کے بعد انہیں مسیحی عقیدہ قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد ملیشیا کی حکومت کے پاس انہیں جیل میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ گذشتہ اکتوبر کے آخری دنوں میں انہیں جیل سے رہا کر دیا گیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنے متبعین سے خطاب کرتے ہوئے اشعری محمد نے الارقم کو تحلیل کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ تنظیم کا خاص لباس یعنی سبز عبا پہننا چھوڑ دیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ الارقم عوامی فلاح و بہبود کے لئے ایک خطرہ تھی۔ لیکن انہوں نے ملی قوانین کے مطابق تنظیم کی تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کو کہا۔

الارقم کے تقریباً ایک لاکھ ملنے والے ملیشیا میں موجود ہیں۔ الارقم کے ممبر زیادہ تر ڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے بڑے لکھے لوگ ہیں جن میں

الارقم کے تقریباً ایک لاکھ ملنے والے ملیشیا میں موجود ہیں۔ الارقم کے ممبر زیادہ تر ڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے بڑے لکھے لوگ ہیں جن میں

الارقم کے تقریباً ایک لاکھ ملنے والے ملیشیا میں موجود ہیں۔ الارقم کے ممبر زیادہ تر ڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے بڑے لکھے لوگ ہیں جن میں

مدنی ایک ایسے شخص ہیں جن میں مفاہمت کی صلاحیت ہے اور آئندہ اسلامک گروپ میں بھی ایسے عناصر ہیں جو گفتگو میں اس کے شروع ہو جانے کے بعد بھی شریک ہونے کو تیار ہیں۔ عالم عرب اور عالم اسلام کے علاوہ یورپ کے لئے ان واقعات کی جو اہمیت ہے اس میں کسی مبالغہ آرائی سے کام لینا مشکل ہے۔ سوڈان کے اسلامی انقلاب کے رہنما اور فعال ترین شخصیت حسن ترابی کی پیشین گوئی کے مطابق اسلامی مطلق العنانی کا سیاسی نظریہ مراقش تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ بحروم کے شمال میں واقع علاقہ کو ہی سبز خطرہ سے تعبیر نہیں کیا جانا چاہئے۔ ابھی تک ترابی پر امید نظر آتے ہیں۔ سوڈان کو بنیاد پرستی کا قلب کہا جاسکتا ہے اس ضمن میں اسے خصوصیت حاصل ہے۔ جب تک کرنل ہدانی زندہ ہیں لیبیا اپنے خود پسند نظریات پر قائم رہے گا۔ مراقش اور تیونس اسلامی انتہا پسندی پر پوری طرح قابو پائے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تیونس لیڈروں کو یہ کہتے ہوئے خاصا تامل ہوتا ہے کہ اسلامی انتہا پسندی کی طرف سے انہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مراقش کے لئے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ اسے ایک ایسے تجربہ کار اور ذی فہم حکمران کی سرپرستی حاصل ہے کہ مسلمانوں کے قائد کی حیثیت سے ان کے اسلامی مرتبے کو مراقشی عوام کی اکثریت تسلیم کرتی ہے۔

تاہم الجزائر کے تجربے سے ہر عرب حکومت کو سبق لینا چاہئے۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ تیل کی دولت جو آج نعمت بنی ہوئی ہے وہی لعنت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ مراقش اور تیونس میں بد عنوانی اور بد نظمی ہو سکتی ہے لیکن تیل سے ہونے والی آمدنی کے فقدان نے انہیں اپنے وسائل کے بھروسے پر ترقی کی جانب قدم باقی صلا پر

اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ دراصل چینیزوں کو اشعری کی معاشی سرگرمیوں اور ترقیوں کی طرف سے فکر تھی مگر یہ بات وہ کھل کر کہہ نہیں سکتے۔ اس لئے وہ الارقم کے ممبران کے لباس وغیرہ پر اعتراض کرتے تھے کہ اس سے سماج میں تاؤ پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حکومت نے مصالحت کے تحت ممکن ہے اشعری کو راضی کر لیا ہو کہ ان کے تبلیغ دار سبز عبا پہننا چھوڑ دیں۔

لیکن یہ تینوں وجہیں قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ مگر اس قیاس آرائی کی ہر حال بڑی مضبوط بنیادیں ہیں۔ ایسے نظریے جو بڑے لکھے لوگوں میں مقبول ہوں، راقول رات بدل نہیں جاتے۔ یا تو کمزور قسم کے لوگ دباؤ میں آکر اپنے نظریے بدل لیتے ہیں، یا وقتی طور پر کسی حکمت عملی کے تحت حالات سے مصالحت کر لیتے ہیں یا غالب گروہ سے کسی سمجھوتے کی وجہ سے اپنے بعض خیالات کو ترک کر دیتے ہیں۔ ہر حال صحیح صورتحال کا پتہ لگانا سہل نہیں ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ چینیزوں کو اس حد تک ضرور کامیابی ملی ہے کہ وہ حکومت کو الارقم کے خلاف درغللے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر سب سے بڑی کامیابی وزیر اعظم ہاشم محمد کو ملی جنہوں نے اپنے خلاف ابھری واحد قابل لحاظ ایوزیشن کو تشدد یا مصالحت کے ذریعہ اگر ختم نہیں کیا تو کم از کم کھٹکالیا ہے۔

کیا اشعری محمد اور ملیشیا کی حکومت میں کوئی خفیہ سودے بازی ہو گئی ہے؟

الزلمات المرشے بنیاد تھے۔ ہاں مسیح موعود سے متعلق صرف اتنی بات ناقابل فہم تھی کہ ان کا ظہور جنوب مشرقی ایشیا سے ہوگا۔ کیونکہ حدیث میں کسی علاقے کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اشعری محمد حکومت کے تشدد کو برداشت نہ کر سکے یا پھر ایک حکمت عملی کے تحت انہوں نے سر دست حکومت سے تصادم سے گریز کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ کیونکہ حکومت نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ نہ صرف ملیشیا بلکہ علاقے

الزلمات المرشے بنیاد تھے۔ ہاں مسیح موعود سے متعلق صرف اتنی بات ناقابل فہم تھی کہ ان کا ظہور جنوب مشرقی ایشیا سے ہوگا۔ کیونکہ حدیث میں کسی علاقے کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اشعری محمد حکومت کے تشدد کو برداشت نہ کر سکے یا پھر ایک حکمت عملی کے تحت انہوں نے سر دست حکومت سے تصادم سے گریز کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ کیونکہ حکومت نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ نہ صرف ملیشیا بلکہ علاقے

الزلمات المرشے بنیاد تھے۔ ہاں مسیح موعود سے متعلق صرف اتنی بات ناقابل فہم تھی کہ ان کا ظہور جنوب مشرقی ایشیا سے ہوگا۔ کیونکہ حدیث میں کسی علاقے کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اشعری محمد حکومت کے تشدد کو برداشت نہ کر سکے یا پھر ایک حکمت عملی کے تحت انہوں نے سر دست حکومت سے تصادم سے گریز کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ کیونکہ حکومت نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ نہ صرف ملیشیا بلکہ علاقے

الزلمات المرشے بنیاد تھے۔ ہاں مسیح موعود سے متعلق صرف اتنی بات ناقابل فہم تھی کہ ان کا ظہور جنوب مشرقی ایشیا سے ہوگا۔ کیونکہ حدیث میں کسی علاقے کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اشعری محمد حکومت کے تشدد کو برداشت نہ کر سکے یا پھر ایک حکمت عملی کے تحت انہوں نے سر دست حکومت سے تصادم سے گریز کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ کیونکہ حکومت نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ نہ صرف ملیشیا بلکہ علاقے

حماس کے خلاف اسرائیلی تشدد جاری رہا تو

مغربی ایشیا کا امن درہم برہم ہو جائے گا

کے عیش اپنے ہی لئے وہ طاقتور بنایا تھا جس سے ایک فلسطینی جاں باز نے تل ابیب میں ایک بس کو اڑا دیا تھا اگر خفیہ ایجنسیاں عیش اور دوسروں کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو اوپر بیان کئے گئے نئے تختی قوانین لاگو ہوں گے۔ ماضی میں اسرائیلی فوجوں کو گولی مارنے کی صرف اسی صورت میں اجازت تھی جب یا تو ان کی اپنی زندگی کو خطرہ ہو یا فرار ہونے والا مشتبہ فرد ان کی وارنٹ

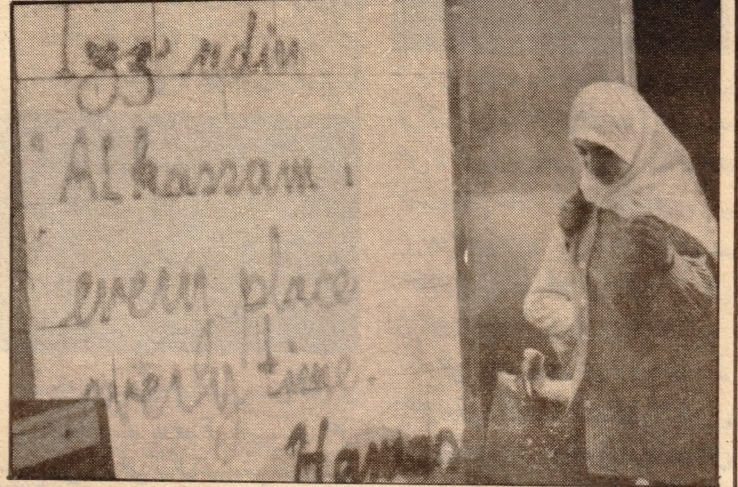
اسرائیلی اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کو توڑنے میں باہر ہیں۔ ماضی میں رہائے گئے فلسطینی قیدیوں نے اپنے جسموں پر تشدد کے نشانات پریس والوں کو دکھائے ہیں اور کتنے ہی تشدد کی تاب نہ لا کر جیلوں میں جاں بحق ہو گئے۔ خود احمق رابن نے پچھلے دنوں غیر متوقع طور پر اسرائیلی جیل میں تختی تشدد کے نتیجے میں ایک فلسطینی کی موت واقع ہو جانے کا اعتراف کیا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا

بظاہر درخت ہلانے جیسے ادبی اعتبار خیال کے پیچھے ایک بھیاں تک تصور کار فرما ہے۔ اسرائیلی قانون کے مطابق تختی تشدد کا روک "معتدل جسمانی دباؤ" یعنی ملکہ تشدد کا حق حاصل ہے۔ تشدد کی انتہائی شکل صرف اس صورت میں قانوناً جائز ہے جب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا ہو۔ مثلاً خفیہ ایجنسیوں کو یہ پتہ چلا ہو کہ فلسطینی کسی کوئی حملے کا پروگرام بنا رہے ہیں یا کسی ناظم ہم رکھا ہوا ہے جس سے بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان ہو گا تو جیل میں بند فلسطینیوں پر تشدد کی انتہائی جا سکتی ہے تاکہ ان سے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مزید اطلاعات فراہم کی جا سکیں۔ تل ابیب ہم دھماکے کے بعد حماس اور اسلامی جہاد کے کارکنوں کو تختی تشددی مراکز پر اسرائیل کے نام نہاد "معتدل جسمانی دباؤ" کا مسلسل سامنا ہے۔ یعنی اس واقعہ کے بعد ان پر مسلسل تشدد جاری ہے۔

بارے میں اطلاعات فراہم کر سکیں۔ موساد کے خفیہ ذرائع کے مطابق اسرائیلی ایجنٹ حماس کی فوجی ونگ عزالدین القسام بریگیڈ کے تقریباً 80 جانے مانے ممبروں کو تلاش کر رہے ہیں۔ تل ابیب کے بس دھماکے کے بعد تقریباً سو

گذشتہ اکتوبر میں ہم دھماکوں اور اغوا جیسے واقعات کے بعد جن میں کئی اسرائیلیوں کو موت کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسرائیلی حکومت بوکھلا سی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ امن مذاکرات تو جاری رہیں گے لیکن اسی کے ساتھ حماس کے خلاف بڑے پیمانے

"عزالدین القسام ہر جگہ اور ہر وقت" حماس کا ایک میسر



حماس کے کارکنوں کو گرفتار کرنا یا گولیوں سے بھونکنا آسان نہ ہو گا۔ یہ چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بے ہوئے لوگ انتہائی پڑھے لکھے سمجھدار اور فوجی اعتبار سے انتہائی تربیت یافتہ ہیں۔ بزدلانہ انداز میں خود کو حوالے کرنے کے بجائے مقابلہ کرنا وہ زیادہ پسند کریں گے۔

پر رکنے سے انکار کر دے۔ نئے قوانین کے مطابق القسام کے جانے مانے کارکنوں پر فوراً گولی چلائی جا سکتی ہے۔ یہ جانے بغیر کہ آیا ان کے پاس ہتھیار ہے یا نہیں۔ لیکن بعض دوسرے افسر یہ کہتے ہیں کہ وہ ایسے سرگرم کارکنوں کو گولیوں سے بھونک دینے کے بجائے زندہ گرفتار کرنا زیادہ پسند کریں گے کیوں کہ ان لوگوں سے ضروری اطلاعات حاصل کی

جب ویکس مین کے اغوا کے بعد موساد کے ایجنٹ حراست میں لیے گئے فلسطینیوں پر مزید اطلاعات کے لئے تشدد کر رہے تھے۔ القسام کے 27 سرگرم کارکنوں کے بارے میں اسرائیلیوں کو پتہ ہے اور ان کا اندازہ ہے کہ مغربی کنارے پر ایسے اور بھی ہیں جن کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں۔ ان مطلوبہ افراد کی فرست میں 28 سالہ یحیی عیش سب سے اوپر ہے۔ اسرائیلیوں کا خیال ہے

فلسطینیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے جن کے بارے میں اسرائیلیوں کا شبہ ہے کہ ان کا القسام بریگیڈ سے تعلق ہے یہ واضح کئے جانے پر کہ بلاوجہ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں جائز نہیں ہیں ایک اسرائیلی افسر نے کہا "ہم درخت ہلا رہے ہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ اس سے کیا نکلتا ہے۔"

پر کارروائی کی جائے گی۔ بڑے منظم انداز میں اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کے افسروں نے پریس کو یہ خبر دی ہے کہ وہ ایک بار پھر حماس کے کارکنوں پر دھاوا بولنے والے ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تشدد کے مزید واقعات رونما ہوں گے۔ حماس کے کارکنوں کو یا تو جیلوں میں ٹھونس دیا جائے گا جہاں ان پر تشدد کیا جائے گا۔ یا پھر انہیں سرے سے گولیوں سے بھونک دیا جائے گا۔ موساد کے ذرائع کے مطابق حماس کے ان کارکنوں کو جو مغربی کنارے پر رہتے ہیں اور جن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ اس تنظیم کے سرگرم کارکن

امریکہ اور اسرائیل کی جانب سے حماس کو ختم کرنے کا عرفات کو حکم مگر...

فلسطینی پولیس کی اکثریت حماس کے خلاف جارحانہ کارروائی کی مخالف

ہے کہ حماس کے خلاف کوئی بھی کارروائی ان کے لئے نقصان دہ ہوگی۔ خود ان کی اپنی پولیس میں بے شمار افراد ہیں جو حماس کے خلاف کسی جارحانہ اقدام کی حمایت نہیں کرتے۔ چند ماہ قبل ایک اسرائیلی پولیس نے اسلحہ جہاد کے پچاس سے زائد کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے دوسرے دن ان کی رشتہ دار خواتین، جن کی تعداد تقریباً دو سو تھی، نے پولیس ہیڈ کوارٹر پر مظاہرہ کیا۔ ایک عمر خاتون نے ایک پولیس افسر کو جب یہ طعنہ دیا کہ یہ ان گرفتار شدگان کی قربانیاں ہیں جن کی وجہ سے تم یہاں موجود ہو تو وہ رونے لگا اور وعدہ کیا کہ وہ انہیں بہت جلد رہا کر دے گا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خود فلسطینی پولیس کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کی طرح حماس اور اسلامی جہاد کے کارکنوں نے بھی اسرائیل کے خلاف جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا ہے۔

اب یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ محدود خود مختاری سے انہیں معاشی طور پر کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ کئی بلین ڈالر کا دنیا اور خصوصاً مغربی ممالک نے جو وعدہ کیا تھا، اس کا عشر عشر بھی ابھی تک نہیں ملا ہے جس کی وجہ سے نئی نوکریاں اور اسمائیں نہیں نکل رہی ہیں۔ غارہ پٹی کے فلسطینی یہ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ مغربی کنارے پر خود مختاری کا معاملہ

راہن اور کلنٹن کا عرفات سے حماس کو ختم کرنے کا مطالبہ تقریباً ناقابل فہم ہے۔ خصوصاً راہن اور اسرائیلی لیڈروں کے منہ سے یہ بات ذرا بھی نہیں بھاتی۔ تحریک انتفاضہ کے دوران اسرائیل اپنے بدنام زمانہ جاسوسی ادارے اور زبردست فوج کی مدد کے باوجود حماس کو ختم نہیں کر سکا۔ اب آخر وہ کس منہ سے عرفات سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ 11

وسط اکتوبر 1994 میں تل ابیب میں ایک بس پر ہم دھماکا اور اس سے قبل ایک اسرائیلی فوجی کا اغوا اور اس کی موت کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے اسرائیل اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ اس نے پہلے تو فی ایل او سے اپنے مذاکرات ایک محدود وقت کے لئے منقطع کر دیے اور پھر غارہ پٹی کی ناکہ بندی کر دی لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس نے یاسر عرفات سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ حماس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا اہتمام کریں۔ راہن نے بڑے غرور سے کہا کہ عرفات حماس اور امن میں سے جس کا چاہیں انتخاب کر لیں۔

القسام بریگیڈ کے سر فزوش کو حماس کی لیڈر شپ کی طرف سے احکام ملتے ہیں جو مغربی کنارے وغیرہ پٹی سے باہر یعنی اردن، شام، لبنان، سوڈان اور ایران وغیرہ میں رہتے ہیں۔ موساد کے ایجنٹوں کو انہیں ٹھکانے لگانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

ایک عام انداز سے کے مطابق حماس کو غارہ پٹی کے تقریباً پچاس فیصد لوگوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس طرح سیاسی اور فوجی سطح پر بھی وہ بہت سی مضبوط ہے۔ فلسطینی پولیس کا بھی خیال ہے کہ حماس کے ارکان نے بھی انکے ساتھ فلسطین کی جدوجہد میں حصہ لیا ہے۔ اس لئے ان کی اکثریت حماس کے کارکنوں کے خلاف جارحانہ کارروائی کی حمایت نہیں کرتی۔

تقریباً کھائی میں پڑ گیا ہے ایسے احساسات اور جذبات کی موجودگی میں اگر عرفات کی پولیس حماس کے کارکنوں کو گرفتار کرتی یا ان پر مظالم ڈھاتی ہے تو ہر کوئی یہی کہے گا کہ عرفات اسرائیل کا گندہ کام کر رہے ہیں۔

ہزار پولیس کی مدد سے یہ کام انجام دیں چاہتے تو یہ کہ اگر عرفات نے ایسا کوئی احمقانہ قدم اٹھایا تو انہیں انجام کار کلف افسوس ہی ملنا پڑے گا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اور ان کی گیارہ ہزار فوجی پولیس حماس کو ختم کرنے میں ناکام رہے گی بلکہ سیاسی سطح پر بھی انہیں زبردست ہزیمت اٹھانی پڑے گی۔ غارہ کا عام آدمی

امریکی صدر بل کلنٹن اسرائیل کے زبردست حامی ہیں۔ انہوں نے راہن کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے تقریباً یہی بات کہی بلکہ یاسر عرفات کو مصر بلا کر ان سے برسر عام یہ اعلان کروایا کہ وہ امن چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب حماس کے خلاف امریکہ و اسرائیل کے اشارے پر صف آرا ہونا چاہتے ہیں۔

ہیں ان پر سب سے زیادہ قہر نازل ہونے والا ہے۔ خفیہ ایجنٹوں کو واضح احکام جاری کئے گئے ہیں کہ حماس اور اسلامی جہاد کے کارکنوں پر گولیاں چلائی جا سکتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حماس کے کارکن چیلنج کئے جانے کے بعد اگر فوراً خود کو اسرائیلی پولیس کے حوالے نہیں کرتے تو انہیں گولیوں سے بھونک دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ حکم بھی جاری کیا گیا ہے کہ حماس اور اسلامی جہاد کے ان کارکنوں پر جو جیلوں میں بند ہیں مزید تشدد کیا جائے تاکہ وہ اس تنظیم کے خفیہ ٹھکانوں کے

باقی صفحہ 5 پر

ہندوستان اور اسرائیل کے درمیان بڑھتے تعلقات

وہ ملک اور گدی امرتسریا جوں کے پسیدہ مقامات ہیں

سیاحت کا فروغ بند اسرائیل
تعلقات کے صرف ایک پہلو
کو واضح کرتا ہے۔ 92 تک
دونوں میں سفارتی تعلقات
نہیں تھے لیکن 32 مہینوں
کے بعد یہ تعلقات بہت
گہرے اور قریبی ہو گئے ہیں۔

تعلقات نہیں تھے۔ لیکن صرف 32 مہینوں کے بعد یہ تعلقات اسرائیلی وزارت خارجہ کے مطابق بہت گہرے اور قریبی ہو گئے ہیں۔

اس دوران دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو فروغ ملا ہے۔ رواں سال کے لئے دو طرفہ تجارت کا تخمینہ چار سو ملین امریکی ڈالر لگایا گیا ہے اور اسرائیلی حکومت کے اندازوں کے مطابق یہ تعداد 1999 تک بڑھ کر ایک بلین ڈالر ہو جائے گی۔

ہندوستان کے زیورات سے اسرائیل کی دوکانیں بھری پڑی ہیں۔ پورے اسرائیل میں ہندوستانی مویشی کھل گئے ہیں اور کیسل وی بی ہندوستانی

کرنے والے اہم ناموں کی فہرست میں سابق خارجہ سکریٹری ہے۔ این۔ دکنشت، ارجن سنگھ، وزراء، تجارت اور سیاحت کے وزراء اور مدار اسٹارنگز، گروت اور ہریانہ کے وزراء اعلیٰ شامل ہیں۔ گذشتہ سال مئی میں اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیرز نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔

اسرائیل میں ہندوستانی سفارتخانے کے فرسٹ سکریٹری این۔ پرساد کتے ہیں۔ یہ بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ ہم بڑے اچھے دوست ہیں۔ اور خود اسرائیل کی سوچ یہ ہے کہ ہندوستان ایشیا میں سب سے اہم ملک ہے۔ اسے۔ رساد کو یہ بھی یقین ہے

کے مابین بڑھتے تعلقات کی ایک "دفاعی توجیہ" بھی کرتے ہیں شوکیٹ کے مندرجہ ذیل الفاظ قابل غور ہیں۔ "یہ حقیقت کہ ہندوستان اسلامی بنیاد پرستی جیسے مسائل سے دوچار ہے، اسے ان ممالک سے زیادہ قریب لار ہی ہے جو اس خطرناک رجحان کو روکنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں مثلاً اسرائیل"۔ اگرچہ دونوں ممالک کسی قسم کے دفاعی معاہدے یا تعاون سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں اسرائیلی وزارت دفاع کے ڈائریکٹر جنرل نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ اسرائیل نے، جسے جمہوریت اور آزادی صحافت کا علمبردار تصور کیا جاتا

اگرچہ دونوں ممالک کسی بھی دفاعی معاہدے یا اتحادوں سے انکار کرتے ہیں لیکن بحلیہ دونوں اسرائیلی وزارت دفاع کے ڈائرکٹر جنرل نے چند وسائل کا دورہ کیا تھا اور علی السبب کے اخباروں نے لکھا تھا کہ دونوں میں بہت جلد ہتھیاروں کا معاہدہ ہونے والا ہے۔

ان بڑھتے ہوئے تعلقات کی وجہ سے اسرائیل
یوں کرتے ہیں کہ زیمبارواؤ حکومت تل ابیب کے
میں دوستی کے جذبات رکھتی ہے جب کہ سابقہ
حکومت کا رویہ معاندانہ تھا۔ ایک دوسری وجہ وہ یہ
بھی بتاتے ہیں کہ ہندوستان کے تاہر اسرائیل سے
متعلق اچھے جذبات رکھتے ہیں کیونکہ انہیں یہاں
اپنی تجارت کو فروغ دینے کے بہر سواقی میسر ہیں۔
لیکن غالباً سب سے بڑی وجہ پاکستان سے
متعلق دونوں ممالک کے رویے اور پالیسیوں میں
یکسانیت ہے۔ دونوں ہی پاکستان کو اپنے لئے بعض
وجوہ سے ایک غطرہ تصور کرتے ہیں۔ اس لئے
دونوں کا ایک دوسرے سے قریب آنا بالکل فطری
ہے۔ یعنی دشمن کا دشمن میرا دوست والی منطق
سہل کام کر رہی ہے۔

اسرائیل میں ہندوستانی سفارتخانہ کے فرسٹ سیکریٹری این پرسار کے مطابق ہم بہت اچھے دوست ہیں اور خود اسرائیل کی سوچ یہ ہے کہ ہندوستان ایشیا میں سب سے اہم ملک ہے۔ ان کو یہ بھی یقین ہے کہ ان بہتر تعلقات کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہیں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ دونوں ممالک جمہوریت میں تھیں رکھنے ہیں۔

پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ ہندوستان یہ امید بھی کر رہا ہے کہ بہت جلد وہ اسرائیلی سرکوں کو کاروبار کی کلاروں سے بھر دے گا۔

سیاحت اور تجارت کے علاوہ سیاسی سطح پر بھی کافی سرگرمیاں ہیں۔ دونوں ممالک کے اہم افسروں اور وزیروں نے دو طرفہ دورے کئے ہیں۔ پہلے دو سالوں میں ہندوستان سے اسرائیل کا دورہ

کہ ان بہر تعلقات کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہیں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ دونوں ہی ممالک جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کا یہی کمنیابہ کہ ہندوستان کے جمہوری نظام کی وجہ سے اسرائیل چین کی نسبت دلی کی طرف زیادہ مائل ہے۔

ہے۔ اس دورے کی رپورٹنگ پر پابندی لگادی تھی
لیکن اس کے باوجود تل ابیب کے بعض
اخباروں نے کھل کر لکھا کہ دونوں ممالک کے
مابین تجارت کی رجحان سے متعلق بہت جلد
ایک معاہدہ ہونے والا ہے۔ این۔ اے۔ پراسد کے
مطابق ”ذکر سے متعلق کچھ باتیں ضرور ہوتی ہیں
لیکن ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں لیا گیا ہے۔“

کیا یہ خیال گویا حریف پھروں کے صدر ہونگے؟

’اس کا فیصلہ عوام کریں گے‘ میں ابھی اپنے ارادے ظاہر نہیں کروں گا۔“

A black and white portrait of a middle-aged man with a receding hairline, smiling broadly. He is wearing a dark suit jacket, a white shirt, and a patterned tie. The background is dark and out of focus.

مجانسل کو رہا چوف بے شک اب اقتدار میں نہیں ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ انہیں تاریخ نے زמוש کر دیا ہو۔ سابق سوویت یونین کے صدر اپنا زیادہ تر وقت تک کہ لونیس، روسی سیاست پر گفتگو اور بین الاقوامی صلیب اخضر کے لئے پوری دنیا کے سفر میں گزارتے ہیں۔ صلیب اخضر ایک ماحولیاتی تنظیم ہے جس کے وہ سربراہ ہیں۔ حال ہی میں انوار نمٹل میڈیا ایسوسی ایشن سے خطاب کرنے وہ لاس انجلس پہنچے تو ان سے میوزک کے نمائندے آری پوزنر نے ملاقات کر کے کے حسب ذیل گفتگو کی:

جواب: ماحولیاتی تحریک میں آپ کی شرکت کا کیا سبب ہے۔

انہوں نے میری طرف سے عالم گیر ماحولیاتی تحریک کے سلسلے میں اٹھائی گئی آواز کی طرف مجھے توجہ دلائی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس ذمہ داری سے پہلو تہی کرنا مجھے اخلاقیاب نہیں دیتا۔

سوال: کہیں ایسا تو نہیں کہ پرنوبل جیسی

چاہئے جو زیادہ ذہن کو بھجوانے والی ہوں۔ اسی طرح روس، میں یعنی سابق سوویت یونین میں ہمارے باہمیاتی مسئلے نے ہمیں اس کے تئیں زیادہ پیدا کرکيا ہے۔

سوال: آج مغرب میں سست سے لوگوں کی

رہا تھا کہ کسی کا ٹیولون آیا۔ دوسری جانب بولنے والا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ایک معروف روسی ادیب تھے جن سے میری اچھی شناسائی تھی انہوں نے کہا کہ ہم نے یہاں بہت سے روسی ادیبوں کو اکٹھا کیا ہے ان میں مختلف سرگرمی وچ بھی ہیں۔

اور اب میں آپ سے معافی کا واسطہ ہوں۔ یہ لوگ معروف اور سنجیدہ ادیب تھے جن کے منہ سے ایسی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روسی حکومت اس وقت جو کچھ کر رہی ہے اور جو اصلاحات لاری ہے اسے دیکھ کر وہاں کے عوام اس نتیجے پر پہنچ رہے ہیں کہ روس میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں وہ ان کی امیدوں کے عین برعکس ہیں۔ وہ اس سے متفق ہیں کہ ملک کو تباہ کرنے کے بجائے انہیں اس کی ترقیوں کو نوکری چاہئے تھی۔ کئی لوگوں نے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کو بہت کم بولنے دیکھتے ہیں حالانکہ ہمیں آپ کا نظریہ جاننے کی خواہش رہتی ہے۔ ” اصل بات یہ ہے کہ ٹیلی ویژن حکومت کی ملکیت میں ہے اور گذشتہ دو سالوں میں گورباچیف کے لئے ٹیلی ویژن پر آ کر ملک کشانی ممکن نہ تھی اس کی وجہ گورباچف اور روسی عوام کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ مسئلہ تھا گورباچف اور پانی ص ۱۱۷ پر

میں ذاتی طور پر ایک نئے اتحاد کو وجود پذیر دیکھنا چاہوں گا۔ جو یوکرین و قزاقستان اور بیلاروس پر مشتمل ہوگا۔ یوکرین کی خود مختار ملک کی حیثیت برقرار رہے گی اور بیلاروس و قزاقستان کی اتحادی حیثیت بھی بحال رہے گی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو نئی جمہوریتیں بھی ٹوٹ کر الگ ہو سکتی ہیں۔

جواب: ہماری تلمیح پر نظر ڈالتے ہوئے آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ شدید مصائب کے دور میں ایسے حالات پر نگرانی سے غور و غوض کرنا

نظر میں ایک ہیرو کا مقام رکھتے ہیں تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود اپنے وطن روس میں آپ اتنے مقبول نہیں ہیں۔

جواب: ابھی کچھ دن پہلے تک میں اپنی مصفا فاتی رہائش گاہ میں اپنی خود نوشت سوانح عمری پر کام کر

کنا یہ ہے کہ آپ کو اقتدار سے ہٹا کر ہم کچھ خوش نہیں ہیں۔ آپ کئی اقتدار سے صدمہ کھاتے اسی لئے اب ہمیں چٹھاؤ ہو رہا ہے۔ اسی دوران کسی اور صاحب نے ریسور تھام لیا اور کنا کہ میں نے ایک بہت ہی سووہ مضمون آپ کے بارے میں لکھا تھا

مغربی ایشیا میں اسرائیل کا مظالم

فلسطین کے مکمل آزادی اور خود مختاری ہی

یہی وجہ ہے کہ وہ انتخابات کے ذریعہ ایک ایسی باڈی کا قیام چاہتی ہے جو نہ صرف انتظامی ہو بلکہ اسے قوانین بنانے کا بھی اختیار ہو۔ اس سے قطع نظر کہ مذکورہ باڈی محض انتظامی ہوتی ہے یا اسی کے ساتھ قانون ساز ادارہ بھی، یہودی آبادیوں کا مسئلہ اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔ جب تک یہ آبادیاں فلسطینی علاقوں میں ہیں، اس وقت تک اسرائیلی فوج وہاں موجود رہے گی اور وہاں بسائے گئے یہودیوں کی حفاظت کے لئے نت نئے ایسے قوانین بھی بنائے گئے جس سے عام فلسطینیوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کو اٹھل (Hebron) کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ تقریباً چار ہزار یہودی شہر سے باہر آباد کئے گئے ہیں بلکہ چار سو سے زیادہ تو عین شہر کے قلب میں بسائے گئے ہیں گذشتہ فروری میں جب ایک یہودی دہشت گرد نے مسجد

ہوجائے کا تو عام انتخابات کے ذریعہ ایک فلسطینی اختیاراتی باڈی کا قیام عمل میں آئے گا جو پورے علاقے پر "حکومت" کرے گی۔ مگر اس باڈی کے بارے میں پی ایل او اور اسرائیل کے درمیان اختلافات ہیں۔ اسرائیل چاہتا ہے کہ یہ صرف ایک انتظامی باڈی ہو جب کہ پی ایل او کی خواہش

ہیں۔ خود اسرائیل کے حامی مغربی ممالک کہتے ہیں کہ کم از کم کچھ آبادیاں تو فوراً ختم کر دی جانی چاہئیں مگر اسحاق رابن اس کے خلاف ہیں اور ظاہر ہے اس کا صاف مطلب ہے کہ اسرائیلی فوج کم از کم ان

تھا۔ اپنے سیاسی کیرئیر کو بچانے کے لئے یاسر عرفات کے پاس بھی اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ دونوں پارٹیاں اپنی مخصوص قسم کی مجبوریوں کے پیش نظر مذاکرات پر آمادہ ہو گئیں۔ مگر آخر کار جس امن معاہدہ پر دستخط ہوئے وہ بنیادی طور پر اسرائیل کے حق میں تھا اور اس سے یاسر عرفات کو کچھ ملاوہ خطرات سے پر ہونے کے علاوہ آئے دن نئے مسائل جنم دینے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔

اسرائیل۔ پی ایل او امن معاہدے میں یوں تو

لو لے لنگڑے امن معاہدے کو پی ایل او اور اسرائیل نے اپنی اپنی مجبوریوں کے تحت نبھایا ہے۔ چاہید مذکورہ بالا مسئلے کو بھی وہ اپنی اپنی مجبوریوں کے تحت حل کر لیں۔ مگر ایسی موقع پرستانہ پالیسیوں اور فلسطین کی مکمل آزادی و خود مختاری کے بغیر حقیقی اور پائدار امن بہر حال قائم نہیں ہو پائے گا۔

ہے کہ اسے قانون بنانے کے بھی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ یہ کوئی معمولی اختلافات نہیں ہے، اس کی تہ میں بہت کچھ ہے، اسرائیل کا منشاء یہ ہے کہ فلسطین بھی ایک آزاد ریاست نہ بن سکے جب کہ پی ایل او کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین جلد از جلد ایک خود مختار ریاست بن جائے۔

علاقوں میں ضرور رہے گی جہاں یہودی آبادیاں موجود ہیں۔ امن معاہدے کے مطابق اگلا اسٹیج مغربی کنارے سے اسرائیلی فوجیوں کی واپسی اور وہاں پر پی ایل او کی عملداری کا ہے جس سے متعلق مذاکرات چل رہے ہیں۔ جب یہ مرحلہ پورا

بہت ساری خامیاں ہیں مگر سب سے بڑا مسئلہ مقبوضہ علاقوں میں آبادی گنی یہودی آبادیاں ہیں، یہ آبادیاں بسائے وقت اسرائیل نے عہد کیا تھا کہ وہ مقبوضہ علاقوں سے نہ صرف دستبردار نہیں ہوگا بلکہ صدیوں سے آباد عربوں کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔ ظاہر ہے یہ آبادیاں ایک مستقل مسئلہ

حماس کے جانبازوں کے سر فروشاہ حملوں نے اسرائیل اور پی ایل او دونوں کے لئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ دراصل ان مسائل کا ابھر کر سامنے آنا بالکل فطری امر ہے۔ کیونکہ اسلو معاہدہ کے پیٹھ سے جنم لینے والا محدود خود مختاری کا معاہدہ ناانصافی پر مبنی ہے۔ یہ دو ایسی پارٹیوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا جو اپنے موجودہ حالات سے پریشان تھیں۔ 1987 سے چل رہی تحریک انتفاض نے اسرائیل کو سفارتی، معاشی اور سیاسی سطح پر کافی نقصان پہونچائے تھے۔ مختصر یہ کہ غاصبانہ قبضہ کو برقرار رکھنا فائدہ مند نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اسرائیل نے ایک ایسے انداز میں اس علاقے کو خالی کرنے کا پروگرام بنایا جس سے اسے کم سے کم نقصان اور فلسطینیوں کو کم سے کم فائدہ پہونچے۔ اس حکمت عملی کے تحت اسرائیل نے یاسر عرفات سے مذاکرات کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ جنگ خلیج میں عراق کا ساتھ دینے کی وجہ سے وہ عرب دنیا میں یک و تنہا ہو کر رہ گئے تھے اور ایسا لگنے لگا تھا کہ ان کا سیاسی کیرئیر اختتام کو آن پہونچا ہے۔ اکثر عرب خصوصاً تیل کی دولت سے مالا مال ممالک کی حمایت سے محروم یاسر عرفات اچانک اسرائیل کو بھلے لگنے لگے کیونکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر سکتا

یروشلم کو مکمل یہودی شہر بنانے کی سازش

آج صورتحال یہ ہے کہ یروشلم کے شمال، جنوب اور مشرق میں یہودی باز آباد کاروں کی بستی کو غیر قانونی طریقے سے وسعت دی جا رہی ہے اور حکومت کی مکمل حمایت اسے حاصل ہے۔ ساتھ ہی اسکا بھی اندیشہ ہے کہ یروشلم کی میونسپل سرحدوں کو بھی وسعت دی جائے گی تاکہ "عظیم یروشلم" کی تشکیل ہو سکے اور شہر میں 78 اور 22 کی شرح سے یہودی اور عرب آبادی تشکیل پا سکے۔ "باز آباد کاری کے انجمن" کے فیصلے کے باوجود

سلسلہ روکا جاسکے۔ جس کے نتیجے میں وادی قدوم میں واقع عدنان ابو نجر کے مکان کو بھی منہدم کر دیا گیا ہے اور وہ اس کی بیوی اور بچے گذشتہ دس مہینوں سے اپنے منہدم شدہ مکان کے سامنے ایک بجری جہاز کے ڈبے میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وادی قدوم میں تقریباً دس مکانات اور ہیں جن پر انہدام کی تلوار لٹک رہی ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں 1967 میں پرانے شہر کے مغربی کوارٹر میں مکانات کے انہدام کے بعد وہاں کے سیکڑوں

مکانات کی تعمیر کی اجازت ہے جبکہ فلسطینیوں کو دو منزل سے اوپر مکان بنانے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ علاوہ بریں یروشلم کے فلسطینی میونسپل خدمات کی کل لاگت کا 26 فیصد ٹیکس کی شکل میں ادا کرتے ہیں۔ جبکہ انہیں اس کے بدلے میں پانچ فیصد میونسپل خدمات بھی میسر نہیں ہو پاتیں۔ جس کے نتیجے میں فلسطینیوں کی چالیس فیصد آبادی میں سوری حکومت بھی نہیں ہے۔ اسرائیلی حکومت کی متعصبانہ پالیسیوں کا

خود یروشلم میونسپلٹی کے ایک مطالعے کے بموجب آج 21 ہزار فلسطینیوں کے پاس یا تو گھر نہیں ہیں یا دوسروں کے ساتھ ایک ایک مکان میں ضرورت سے زیادہ تعداد میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ان افراد نے باؤسنگ زون میں اپنے مکانات تعمیر کئے تھے لیکن حکومت نے آئین و قانون کا غلط طریقے سے سہارا لیکر انہیں 68 فیصد زمین سے بے دخل کر دید۔ جس کے نتیجے میں بے شمار خاندان کیمپوں، بسوں اور غاروں میں بیٹے کے

یروشلم کی مذہبی اور سیاسی حیثیت نے اس حقیقت کو دھندلا دیا ہے کہ کس طرح سے فلسطینیوں کو منصوبہ بندی کے تحت بے دخل کیا گیا اور یہودیوں کو بسایا گیا ہے۔ یہاں یہودی اکثریت کے قیام کے مقصد کے پیش نظر فلسطینیوں کی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ کیا گیا تاکہ مکانات کو منہدم کیا گیا اور لائسنس نہ دینے کی پالیسی پر عمل کیا گیا تاکہ فلسطینی وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس پالیسی پر عمل آوری کے نتیجے میں آج مشرقی یروشلم

بے شمار فلسطینی خاندان کیمپوں، بسوں اور غاروں میں پینے کے پانی، بجلی اور سیر کی سہولیات کی عدم موجودگی میں زندگی گزار رہے ہیں یا پھر دوسروں کے گھروں میں غیر صحتمند ماحول میں بھیڑ بھڑکی شکل میں جینے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی پالیسی بھی یہودیوں کی حمایت کرتی ہے۔ انہیں آٹھ آٹھ منزلہ مکان بنانے کی اجازت ہے جبکہ فلسطینیوں کو دو منزل سے اوپر نہیں لے جانے دیا جاتا۔

اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ 70 ہزار یہودی باز آباد کاروں کو مکانات کی تعمیر میں امداد دی گئی ہے جبکہ فلسطینیوں کے محض 555 خاندانوں کو سولت دی گئی ہے۔ باؤسنگ زون میں زمینوں کی قلت کے سبب مکان تعمیر کرنے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ اگر بغیر اجازت کے کوئی مکان تعمیر کرتا ہے تو اسکا مطلب ہے اسکا انہدام خواہ مکان کے ایک ہی حصے کو کیوں نہ منہدم کر دیا جائے۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق وسط 1987ء سے اب تک مشرقی یروشلم میں فلسطینیوں کے 222 مکانات کو منہدم کیا جا چکا ہے۔ یہ سلسلہ بدستور جاری ہے اور مکانات کے انہدام کی شرح پچاس مکان سالانہ ہے

پانی، بجلی اور سیر کی سہولیات کی عدم موجودگی میں زندگی گزار رہے ہیں یا پھر دوسروں کے گھروں میں غیر صحت مند ماحول میں بھیڑ بھڑکی شکل میں جینے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی پالیسی یہودی باز آباد کاروں کے حق میں ہے۔ جس کی بناء پر انہوں نے فلسطینیوں کی غصہ شدہ زمینوں پر ان کی رہائش گاہوں سے چند میٹر کے فاصلے پر اپنے مکانات تعمیر کر لئے ہیں ان یہودی باز آباد کاروں کو آٹھ منزلہ

فلسطینیوں کی آبادی گھٹ کر ایک لاکھ 55 ہزار ہو گئی ہے جبکہ یہودیوں کی آبادی ایک لاکھ 60 ہزار تک پہونچ گئی ہے۔ فلسطینیوں کو کس طرح یروشلم سے منظم طریقے سے بے دخل کیا گیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف 1967ء کے بعد سے یروشلم میں آباد پچاس ہزار فلسطینیوں کو یا تو میونسپل سرحدوں سے باہر ملک سے باہر کھڑ دیا گیا ہے اور یہودیوں کی ایک لاکھ 60 ہزار ہو گئی ہے۔

یروشلم کی آبادی گھٹ کر ایک لاکھ 55 ہزار ہو گئی ہے جبکہ یہودیوں کی آبادی ایک لاکھ 60 ہزار تک پہونچ گئی ہے۔ فلسطینیوں کو کس طرح یروشلم سے منظم طریقے سے بے دخل کیا گیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف 1967ء کے بعد سے یروشلم میں آباد پچاس ہزار فلسطینیوں کو یا تو میونسپل سرحدوں سے باہر ملک سے باہر کھڑ دیا گیا ہے۔

یروشلم میونسپلٹی کی سالانہ رپورٹ کے مطابق یہودیوں کے لئے 31413 نئے مکانات کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور اس کے ساتھ چار ہزار اضافی عمارت بھی معرض وجود میں آئیں گی۔ جبکہ دوسری طرف فلسطینیوں کے رہائشی مکانات کا مسئلہ حل کرنے کی جانب اسرائیلی حکومت کی طرف سے کوئی قدم نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔

فلسطینیوں نے آکر رہائش اختیار کر لی ہے۔ واضح ہو کہ فلسطینیوں کو وہاں سے اس لئے بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا تھا تاکہ دیوار گریہ کے سامنے یہودی کوارٹروں اور ایک رہائشی پلازہ کی تعمیر ہو سکے نیز یہودی باز آباد کاروں کی بستی کو وسیع کیا جاسکے۔ اس واقعے کے 27 سال بعد یہ لوگ ایک بار پھر بے دخلی کے عذاب میں مبتلا اور بین الاقوامی توجہ کے محتاج ہیں۔

انتظامیہ دیہی علاقوں میں بھی مکانات کو منہدم کرتی ہے تاکہ بغیر اجازت کے مکانات کی تعمیر کا

یروشلم کی آبادی گھٹ کر ایک لاکھ 55 ہزار ہو گئی ہے جبکہ یہودیوں کی آبادی ایک لاکھ 60 ہزار تک پہونچ گئی ہے۔ فلسطینیوں کو کس طرح یروشلم سے منظم طریقے سے بے دخل کیا گیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف 1967ء کے بعد سے یروشلم میں آباد پچاس ہزار فلسطینیوں کو یا تو میونسپل سرحدوں سے باہر ملک سے باہر کھڑ دیا گیا ہے۔

یروشلم کی آبادی گھٹ کر ایک لاکھ 55 ہزار ہو گئی ہے جبکہ یہودیوں کی آبادی ایک لاکھ 60 ہزار تک پہونچ گئی ہے۔ فلسطینیوں کو کس طرح یروشلم سے منظم طریقے سے بے دخل کیا گیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف 1967ء کے بعد سے یروشلم میں آباد پچاس ہزار فلسطینیوں کو یا تو میونسپل سرحدوں سے باہر ملک سے باہر کھڑ دیا گیا ہے۔

کیا مغرب کا دنیا عالمی نظام میں دجال کا نظام ہے؟

بدلتا ہوا عالمی منظر نامہ اور غلبہ اسلام کی جدوجہد دجال کی آمد کا پیش خیمہ تو نہیں؟

پوری دنیا خصوصاً مغرب میں غلبہ اسلام کے لئے جو جدوجہد چل رہی ہے اس کے پیش نظر یہ بات کی جارہی ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا پر اسلامی پرچم کے لہرانے کا زمانہ شاید قریب آگیا ہے۔ کچھ معتمدین قرآن بھی قرآن کریم کی آیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اسی قسم کی بات کہہ رہے ہیں۔ بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے اور مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے بتدریج معزز ہونے اور عالم اسلام کی جانب سے اسے شرف قبولیت بخشنے کے تناظر میں اس پیش گوئی کے پچ ثابت ہونے کا بھی زمانہ شاید قریب آگیا ہے کہ قیامت سے قبل مسیح دجال کا

(بعض اولیاء بعض) کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک پیش گوئی تھی جو آج کے زمانے میں پوری ہوئی اور اس کا تسلسل مرحلہ حال ہی میں ڈرامائی انداز میں سامنے آیا ہے جب پوپ کے ایک فرمان کے ذریعہ ساڑھے انیس سو سالہ تاریخ بدل دی گئی اور وہ یسودی قوم جو خدا کے صلیبی بیٹے کو سولی دینے کی مجرم قرار دی جاتی تھی بیک جتیش قلم بری قرار دی گئی پھر چند ہی ہفتے قبل خیر آئی کہ وین کن (Vatican) نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کا سفارت خانہ بہت جلد یروشلم میں

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دجال کے عالمی نظام کی تکمیل میں اب تک جو خط سب سے زیادہ مزاحمتاں ہو رہا تھا وہ مسلمانوں پر مشتمل مشرق وسطیٰ کا وہ علاقہ تھا جسے اب عرب و اسرائیل امن مشن کے نام پر فتح کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بات محض اتفاقی نہیں ہو سکتی کہ اس سلسلے کی امن کانفرنس تہذیب مجازی کے مزار اسپین کے دار الخلافہ میڈرڈ میں منعقد ہوئی۔

قائم ہو جائے گا اور یہ تو کچھ ہی دنوں قبل کی بات ہے کہ اسرائیل کے وزیر اعظم اسحاق رابن نے

وسطیٰ کا وہ علاقہ تھا جسے اب عرب و اسرائیل امن مشن کے نام پر فتح کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بات محض اتفاق نہیں ہو سکتی کہ اس سلسلے کی امن کانفرنس تہذیب مجازی کے مزار اسپین کے دار الخلافہ میڈرڈ میں منعقد ہوئی۔ دجال کے اس عالمی نظام کی قیادت بظاہر اس وقت امریکہ کر رہا ہے جسے دراصل اس وقت یسودیوں کی سیاسی قوت کے اعلائے کی حیثیت حاصل ہے۔ نئے دجالی نظام میں ایک اہم رول اقوام متحدہ بھی ادا کر رہا ہے جو دراصل اسرائیلی مفادات کا ہی محافظ ہے اور جس پر اسرائیل کی گرفت سخت ہے۔ واضح رہے کہ اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل بطرس غالی کو اپنی نامزدگی سے قبل اور امریکی صدر سے بھی اپنی ملاقات سے قبل اسرائیلی وزیر اعظم کی رضامندی حاصل کرنی پڑی تھی۔ پھر امریکہ کا پورا وجود ہی اسرائیل کی حفاظت و سرپرستی کے لئے قائم ہے جس کا اظہار خلیج کی جنگ کے موقع پر اتحادی افواج کے کمانڈر جنرل شورز ڈکراف نے کیا تھا، جنگ کے فوراً بعد اس نے کہا تھا کہ ہم نے یہ جنگ صرف اسرائیل کے تحفظ کے لئے لڑی ہے اور اس سے بھی اہم



واشنگٹن سے واپسی پر روم میں پاپائے اعظم سے ملاقات کی اور انہیں اسرائیل کا دورہ کرنے کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ کوئی چیز یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ اس کی حفاظت تین ہزار برس تک تو ہم

بات یہ ہے کہ امریکہ کے سابق صدر کی کتاب "سبز دی موومنٹ" خلیج کی جنگ کے بعد شائع ہوئی اس میں بھی انہوں نے لکھ دیا کہ اسرائیل کی حفاظت ہماری خارجہ پالیسی کا اہم ترین جز ہونا چاہئے۔

یا امریکہ ہو یا برطانیہ، فرانس اور اقوام متحدہ ہو یا "جی سیون" سب صیونیت کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔

پھر قرآن کے ارشادات اور احادیث نبویؐ میں المسیح الدجال کے متعلق تفاسیر کی روشنی میں نئے صیونی عالمی نظام کو بھی کھٹنے کی کوشش کی جانی چاہئے یسودی خود کو خدا کی پسندیدہ قوم سمجھتے ہیں اور دوسرے تمام انسانوں کو انسان ناجوان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ان کے معاشی استحصال

درندے کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے سات سر ہیں اور دس سینک اور اس پر ایک عورت سوار ہے۔ یہ درندہ خود بھی مجسم کفر اور الحاد ہے اور اس پر سوار عورت بھی سرتاپا بدکاری کا نمونہ ہے۔ مکاشفہ کے مطابق اس درندے کا مقابلہ ایک میمنہ سے ہوگا جو اسے ہلاک کر دے گا حکمت ایمانی سے ادنیٰ ترین مناسبت رکھنے والا شخص بھی فوراً پہچان لے گا کہ یہ اصل فتنہ دجال کی تعبیر ہے چنانچہ درندے سے مراد مد حاضر کے خوفناک ہتھیاروں

مکاشفات یوحنا میں ایک درندے کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے سات سر اور دس سینک ہیں اور اس پر ایک عورت سوار ہے۔ اس درندے کا مقابلہ ایک میمنہ سے ہوگا جو اسے ہلاک کر دے گا۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ درندے سے مراد مد حاضر کے خوفناک اسلحوں سے لیس مغربی ممالک ہیں جن کے جسد واحد ہونے کا ثبوت جنگ خلیج میں مل گیا ہے۔ کیا عجیب کہ سات سروں سے مراد آج کے "جی سیون" ہوں اور اس درندے پر سوار عورت سلطنت اسرائیل ہو۔

سے لیس مغربی ممالک ہیں جن کے جسد واحد ہونے کا ثبوت خلیج کی جنگ میں واضح ہو کر سامنے آچکا ہے اور کیا عجیب کہ سات سروں سے مراد آج کے جی سیون ہوں اور ان کے سروں پر سوار وہ بدکار عورت سلطنت اسرائیل ہے جس کی حفاظت کے لئے یہ تباہ کن جنگ لڑی گئی تھی۔ اور رہا وہ میمنہ جو اس عفریت کو ہلاک کرے گا وہ دراصل حضرت عیسیٰ جیسے بے ضرر اور رقیق القلب انسان کی تعبیر ہے جن کی آمد کے عیسائی اور مسلمان دونوں منتظر ہیں اور جن کے ظہور کا شاید وقت قریب آچکا ہے۔

بقیہ: اسلامی اسکارف

ایجنٹ کے لئے الجزائر کی زمین تنگ ہو جائے گی اور انہیں چار و پانچ فرانس کی جانب ہجرت کرنا ہوگا۔ جس سے فرانس میں مہاجرین کی تعداد حد درجہ بڑھ جائے گی جس کا پوچھ فرانس کی معیشت برداشت نہ کر سکے گی۔ یہی سبب ہے کہ فرانسیسی حکومت نہ صرف الجزائر کی غیر آئینی غیر جمہوری فوجی حکومت کو اپنی حمایت جاری رکھنے کی پالیسی پر کار بند ہے۔ بلکہ خود فرانس میں مقیم عام مسلمانوں اور بالخصوص الجزائر کے ان سرفروشان اسلام کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنائے ہوئے ہے جو الجزائر کے اسلامک فرنٹ کے حامی ہیں یا ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ بہر کیف فرانسیسی حکومت کی اسلام دشمنی کا رویہ سرفروشان اسلام کے عزائم کو کمزور کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فرانسیسی حکومت کی تادیبی اور جارحانہ کارروائیوں اور مسلم خواتین اور طالبات کے لئے اسکارف کے استعمال پر پابندیوں کے حکم کے خلاف فرانس میں پرزور احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ جیسے بعض جمہوری اداروں اور انسانی حقوق کے علمبردار حلقوں سے بھی حمایت مل رہی ہے۔

امریکہ کی قیادت میں نئے عالمی نظام کا نعرہ دراصل فتنہ دجالیت کا نقطہ عروج اور مسیح دجال کے ظہور کی تعبیر ہے۔ جس میں اصل عامل کی حیثیت تو یہودیت کو حاصل ہے البتہ پورا عالم عیسائیت یہودیت کا شریک کار اور آلہ کار ہے۔ گویا امریکہ، برطانیہ اور فرانس سبھی "جی سیون" کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں

اسلم کی پیش گوئی کی تفسیر ہے کہ دجال یک چشم ہوگا۔

ایک دوسری دلچسپ بات بائبل کی آخری کتاب مکاشفات یوحنا کے سترہویں باب میں درج ہے اس باب میں ایک ایسے عظیم اور خوفناک

امریکہ کی قیادت میں نئے عالمی نظام کا نعرہ دراصل فتنہ دجالیت کا نقطہ عروج اور المسیح الدجال کے ظہور کی تفسیر ہے جس میں دراصل اصل عامل کی حیثیت تو یہودیت کو حاصل ہے البتہ پورا عالم عیسائیت بھی یہودیت کا شریک اور آلہ کار ہے گو

نے کی ہے۔ اب یہ آپ کے حوالے ہے اور آئندہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دجال کے عالمی نظام کی تکمیل میں اب تک جو خط سب سے زیادہ مزاحمتاں ہو رہا تھا وہ مسلمانوں پر مشتمل مشرق

ظہور ہوگا۔ موجودہ عالمی حالات اور مغربی ممالک و عالم اسلام میں رونما ہونے والے واقعات کے پیش نظر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ واقعات مسیح دجال کی آمد کا پیش خیمہ تو نہیں ہیں؟ پاکستان کے ایک معروف معلم قرآن ڈاکٹر اسرار احمد کے تجزیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس پر یقین کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں رہ جاتا کہ مطلع عالم پر آفتاب اسلام کے جگمگانے اور پوری دنیا کی فضاوں میں پرچم اسلام کے لہرانے کا زمانہ شاید قریب آگیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے بعض حالیہ واقعات کو احادیث کی روشنی میں کچھ اس انداز سے دیکھا ہے کہ عام آدمی کی نگاہوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا کہنا ہے کہ مغرب کا دنیا عالمی نظام اسی مسیح دجال کا نظام ہے جس کے کلی قیام کے بعد حضرت مسیح کا ظہور لازم ہو جائے گا۔ قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ یسودی اور عیسائی آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور حمایتی ہیں (المائدہ 51-52) وہ کہتے ہیں کہ دراصل ایک پیش گوئی تھی جو آج کے زمانے میں پوری ہوئی ہے۔ ورنہ (بعض اولیاء بعض) کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ اس سے قبل عیسائیت کی پوری دو ہزار سالہ تاریخ کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں میں مسلسل دشمنی رہی ہے چنانچہ پہلے تین سو سال تک یہودی اور رومی دونوں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں اور جب چوتھی صدی عیسوی میں رومی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی تو اس کے بعد سے مسلسل یہودیوں پر عرصہ حیات تنگ کرتے رہے یہاں تک کہ خود بیسویں صدی کے وسط میں نازی جرمنی کے عیسائیوں نے ساتھ لاکھ یہودیوں کو نیست و نابود کیا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ خود جس وقت قرآن کی یہ آیت نازل ہو رہی تھی اس وقت اور اس کے بعد بھی فی الواقع عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان دوستی موجود نہیں تھی لہذا

مغرب کی خدا بے زار تہذیب پر

اسلام کی اسکراف فرس کا حملہ

کے درمیان جانیں تلف ہو چکی ہیں علاوہ بریں کم از کم 56 غیر ملکی باشندے بھی اس جنگ کا شکار ہو چکے ہیں جن میں سے 15 باشندے فرانسیسی تھے۔ چونکہ فرانسیسی حکومت البرازری موجودہ غیر ایٹنی و غیر جمہوری فوجی حکومت کی حالی ہے اس لئے اسے پھر ہر لمحہ خدشہ ہے کہ فرانس میں موجودہ مسلم البرازری باشندے جن کی پوری ہمدردی اور حمایت اسلامک سالویشن فرنٹ کے ساتھ ہے وہ فرانسیسی حکومت کے لئے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ فرانسیسی حکومت نے البرازری بڑا مسلم باشندوں کے خلاف زبردست جارحانہ سم پھیر رکھی ہے، گذشتہ دو کثیر تعداد میں البرازری مسلم نوجوانوں کا فرانس سے انخلاء اور عام طور پر مسلم باشندوں کے خلاف تادیبی کارروائی اور ان پر کڑی نگرانی اس کے خوف کا پردہ فاش کرتی ہیں۔



اسلامی اسکراف پر پابندی کے خلاف مسلم طالبات کا پرزور مظاہرہ

فرانس کے موجودہ وزیر داخلہ چارلس پادکا جو نسلی تعصب اور جارحانہ رویے کی لئے فرانسیسی نیو فاشٹ حلقوں میں تحسین کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اسلام دشمنی کے زبردست علمبردار ہیں۔ پادکا کے مطابق ہر مسلم اپنے اندر بنیاد پرستی کا مادہ رکھتا ہے۔ لہذا وہ قابل تہذیب ہے۔ یہی سبب ہے کہ پادکا کے حکم پر پورے فرانس میں اسلام سے تعلق رکھنے والا ہر شخص مشکوک بن چکا ہے اور بالخصوص

زیب تن کرنے کی زبردست مہم بھی شامل ہے۔ سرورق ہوں یا بازار ریلوے اسٹیشن ہوں یا ہوائی اڈہ اسکول ہوں یا کلن ہر جگہ مسلم خواتین اپنے اسلامی لباس اور شرعی لوازم کی پیروی کرتی نظر آتی ہیں۔ بالفاظ دیگر پردے پر دھنسی مقبولیت فرانس کے اس سید پر معاشرے میں اسلامی تقصیر اور شناخت کی علامت بنتی جا رہی ہے۔ جو فرانس کی اباحت زدہ حکومت اور جماعتوں کے لیے رفتہ رفتہ نفسیاتی شکست کی علامت بھی تصور کی جانے لگی ہے۔

لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ فرانسیسی حکومت کا یہ اقدام سراسر اس کے اسلام مخالف رویے کا اظہار ہے کیونکہ فرانس میں دیگر مذاہب کے پیروں پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے لئے گے میں کراس یا ڈیو اسٹار لٹکانے یا یسودیوں کے لئے صیونی ٹوپی پہننے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ اس اعتبار سے فرانس کا یہ قدم اسلام کے خلاف امتیازی سلوک کے مترادف ہے۔ علاوہ بریں خود دیگر مغربی ممالک میں کسی مذہب کے پیروں کے خلاف ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ خواہ جرمین ہو یا انگلینڈ، اسپین ہو یا اٹلی یا پھر امریکہ کسی بھی مذہبی تقصیر اور شناخت کے اظہار پر کسی قسم کی کوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔ اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ لوگ جمہوری اور جدید طرز فکر کے معاشرے میں اخلاقی اطوار، تہذیب و ثقافت اور لباس و خوراک اختیار کرنے اور ان پر کاربند ہونے کے مجاز ہوں، ورنہ ایک ترقی یافتہ معاشرے کی مفاہمت و ہم آہنگی اور

گذشتہ دنوں فرانس کی حکومت کی جانب سے فرانس میں مقیم مسلم طالبات کے ذریعے اسلامی اقدار و شرعی تقاضے کے مطابق سروں پر اسکراف یا چادر کے استعمال پر پابندی مغربی دنیا کی اس نفسیاتی شکست کا کھلا اعلان ہے جو ان ممالک میں رائج اباحتیت کے بالمقابل اسلامی اقدار کی پیروی اور اس کی مقبولیت سے پیدا ہو رہی ہے۔ جو لوگ مغربی ممالک کی صورت حال اور وہاں کی تہذیبی، مذہبی و اخلاقی حالت زار سے واقف ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اپنی سائنسی ترقی کے تمام تر بلند و بانگ دعوے کے باوجود مغربی دنیا زبردست قسم کے اخلاقی بحران سے دو چار ہے۔ کیوں کہ سائنسی ترقی کا غلام مغربی معاشرہ بظاہر کتنا بھی روشن خیال اور چمک دمک میں ملبوس کیوں نہ نظر آتا ہو اس کے بطون میں اخلاقی و روحانی غلاء اور تاریکی کا سایہ اسی شدت سے گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں ان ممالک میں مقیم اسلام کے پیروکاروں کے اقدار و اطوار اور ان کا فکری و روحانی پیغام مسیب تاریکی میں روشن شمع کی طرح اپنے پروانوں کے لئے کشش کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ نتیجے میں آئے دن بڑی تعداد میں مغربی ممالک کے اخلاقی حالت زار سے بدلتی خواتین و مرد اسلام کی جانب کھینچے چلے جا رہے ہیں۔ اس وقت بالخصوص مغربی ممالک کی خواتین میں اسلامی اقدار کی جانب راغب ہونے کا رجحان کافی مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اسلامی پردے کے خلاف فرانسیسی حکومت کا حالیہ تادیبی قدم مغرب کی اسی بوکھلاہٹ کا اشاریہ ہے۔

فرانس اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور ماڈرن معاشرہ تصور کیا جاتا ہے ظاہر ہے اس معاشرے میں اباحتیت بھی اسی درجہ عروج پر ہے۔ اشتعال انگیز موسیقی و رقص ہو یا عریانی کی

فرانس کا معاشرہ مغربی دنیا کی نام نہاد "ماڈرنزم" کا معیار تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس معیار کو اس وقت اسلامی اقدار و معیار سے زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ کیوں کہ البرازری بڑا اسلامی جیالوں نے فرانسیسی معاشرے کے سامنے جو چیلنج پیدا کر دئے ہیں اس سے فرانسیسی حکومت کے ہوش گم ہوتے نظر آ رہے ہیں۔

مبصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلامی انقلابیوں سے فرانسیسی حکومت کے خلاف ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ فرانس کی موجودہ حکومت البرازری کی غیر ایٹنی فوجی حکومت کی حالی ہے۔ جس کے خلاف البرازری اسلامک سالویشن فرنٹ برسر پیکار ہے۔ کیونکہ 1992 میں البرازری میں ہونے والے جمہوری انتخابات میں اسلامک سالویشن فرنٹ اقتدار میں آ رہی تھی لیکن فوجی جارحیت کے ذریعہ البرازری حکومت نے اسلامک سالویشن فرنٹ کے جمہوری انتخابات کو ناکامی میں تبدیل کر کے اسلامک سالویشن فرنٹ کو ہتھیار بند بغاوت پر مجبور کر دیا تھی۔ گذشتہ دو برسوں سے اسلامک سالویشن فرنٹ البرازری میں جمہوری نظام کے قیام کے لئے ہتھیار بند احتجاج جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس احتجاج اور فوجی جارحیت کے نتیجے میں ایک اندازے کے مطابق کم از کم چار ہزار سے دس ہزار

فرانسیسی حکومت کا یہ قدم سراسر اس کے اسلام مخالف رویے کا اظہار ہے کیونکہ فرانس میں دیگر مذاہب کے پیروں پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے لئے گے میں کراس یا ڈیو اسٹار لٹکانے یا یسودیوں کے لئے صیونی ٹوپی پہننے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ اس اعتبار سے فرانس کا یہ قدم اسلام کے خلاف امتیازی سلوک کے مترادف ہے۔ علاوہ بریں خود دیگر مغربی ممالک میں کسی مذہب کے پیروں کے خلاف ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ خواہ جرمین ہو یا انگلینڈ، اسپین ہو یا اٹلی یا پھر امریکہ کسی بھی مذہبی تقصیر اور شناخت کے اظہار پر کسی قسم کی کوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔ اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ لوگ جمہوری اور جدید طرز فکر کے معاشرے میں اخلاقی اطوار، تہذیب و ثقافت اور لباس و خوراک اختیار کرنے اور ان پر کاربند ہونے کے مجاز ہوں، ورنہ ایک ترقی یافتہ معاشرے کی مفاہمت و ہم آہنگی اور

فرانسیسی حکومت کا یہ قدم سراسر اس کے اسلام مخالف رویے کا اظہار ہے۔ کیوں کہ فرانس میں دیگر مذاہب کے پیروں پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے لئے گے میں کراس یا ڈیو اسٹار لٹکانے یا یسودیوں کے لئے صیونی ٹوپی پہننے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ تو پھر اسکراف پر پابندی کیوں؟

ابتدا کو پہنچا لباس اور فیشن فرانس کا معاشرہ مغربی دنیا کی نام نہاد "ماڈرنزم" کا معیار تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس معیار کو اس وقت اسلامی اقدار و معیار سے زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ کیونکہ البرازری بڑا اسلامی جیالوں نے فرانسیسی معاشرے کے سامنے جو چیلنج پیدا کر دیے ہیں ان میں دیگر اسلامی اقدار و اخلاق کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں مسلم خواتین کے ذریعے پردے اور مذہب و باعصمت لباس

ابتدا کو پہنچا لباس اور فیشن فرانس کا معاشرہ مغربی دنیا کی نام نہاد "ماڈرنزم" کا معیار تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس معیار کو اس وقت اسلامی اقدار و معیار سے زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ کیونکہ البرازری بڑا اسلامی جیالوں نے فرانسیسی معاشرے کے سامنے جو چیلنج پیدا کر دیے ہیں ان میں دیگر اسلامی اقدار و اخلاق کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں مسلم خواتین کے ذریعے پردے اور مذہب و باعصمت لباس

(باقی صفحہ 9)

ملی طاغوت انٹرنیشنل 9

سپریم کورٹ فیصلے کی حقیقت کیا

24 اکتوبر 1994 کو سپریم کورٹ نے باہمی متعلقہ عدالتی ریفرنس کو واپس کرتے ہوئے جو فیصلے سنائے اس سے ہندوستانی عدلیہ کے کردار کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ سپریم کورٹ کا زیر بحث فیصلہ تین بنیادی نکات پر مشتمل ہے۔

اول یہ کہ صدر جمہوریہ ہند نے سرسارواؤ حکومت کی ایما پر 7 جنوری 1993 کو آئین کے دفعہ 143 کے تحت ایک نفاذی حوالے کے ذریعے سپریم کورٹ سے حوالے طلب کی تھی کہ کیا باہمی مسجد کی تعمیر سے قبل اس مقام پر کوئی مندر یا کوئی بھی ہندو ڈھانچہ "موجود تھا؟" سپریم کورٹ نے اس حوالے کو غیر ضروری اور قانونی قرار دیتے ہوئے اسے واپس صدر کو بھیج دیا۔ فیصلہ کیا ہے اور یہ کہ اس کے سپریم کورٹ اس پر راجہ دینی کو ضروری نہیں گردانتی۔

دوسرے یہ کہ سپریم کورٹ نے 7 جنوری 1993 کو بی مرکزی حکومت کی جان سے اجوہیا لیڈ ایکوریشن ایکٹ 1993 کے تحت باہمی مسجد

مقدمات اور قانونی کارروائیوں کے بدلے کی اجازت مذکورہ استصواب کے لئے اختیار کردہ شرائط کی تکمیل کر کے دی جاسکتی ہے۔ ہمارے خیال میں تینا بی بات دستور کی دفعہ 4 کی ذیلی دفعہ (3) کے جواز کی نفی کرنے کے لئے کافی ہے۔ تاہم دفعہ 4 کی ذیلی دفعہ (4) کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے باقی ماندہ قانون جسے جائز قرار دیا جا چکا ہو اس میں اس ذیلی دفعہ کا عوامی جواز کوئی رخنہ نہیں ڈالنا پڑا (65) اس کے نتیجے کے طور پر تمام زیر غور مقدمات اور

مذکورہ بالا ایکٹ کی دفعہ (3) (4) دستور ہند فقرہ 143 (1) کی روشنی میں جس کا موضوع کسی جائداد کے حقوق ملکیت اور اس کے متعلقہ مقدمات سے متعلق مرکزی حکومت کو ملے ہوئے اختیار کے سلسلے میں زیر غور مقدمات اور قانونی کارروائیوں کا سقوط ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کا قانونی جواز ہے۔ اس پر کیا گیا کہ مرکزی حکومت کی تجویز یہ ہے کہ محول بالا سوال کا جواب ملنے کے بعد دونوں دعویٰ اور فریقوں سے گفت و شنید کی جائے

پر بحث کی گئی اس ضمن میں یہ وضاحت کی گئی کہ جیسا کہ پہلے کہا چکا ہے کہ لفظ حصول کے مفہوم کے مختلف پہلو ہیں جن پر اس کے سیاق اور محل استعمال کا اثر پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس صورت میں اس سے مراد مکمل حصول ہو۔ اسی لئے اس کا استعمال محدود حصول کے معنوں میں بھی ہو سکتا ہے اور اس کا استحقاق اور مدت دونوں اعتبارات سے محدود ہو سکتا ہے پیرا (44) لہذا اس ایکٹ کی دفعہ 3 کی رو سے متنازعہ جگہ کے تعلق سے

ڈاکٹر ایم اسماعیل فاروقی (مدعی) بنام حکومت ہند دیگر (مدعا علیہ) ایکٹ بابت قبضہ آرا صنی مخصوصہ بمقام ایوہیا مجریہ 1993 دستور ہند فقرہ 245 ساتواں شیڈول فرسٹ سوم اندراج نمبر 42 جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کیا پارلیامنٹ قانون وضع کرنے کی مجاز تھی۔ یہاں قانون سازی کا موضوع و مواد "جائداد پر قبضہ پانا" ہے اور یہ کہ یہ پوری طرح اندراج نمبر 1 فرسٹ دوم کے دائرہ کار میں آتا ہے جس کا تعلق "پبلک آرڈر سے ہے" (ملاحظہ ہو پیرا 29) دستور کے Baventh ترمیمی ایکٹ کے نتیجے میں مرقوم فرسٹ سوم کے مفصل اندراج 42 سے کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ قبضہ آرا صنی سے متعلق اس طرح کا کوئی ایکٹ واضح طور پر اس اندراج کے دائرہ کار میں آتا ہے اور اس لئے اس قانون کے نفاذ کے لئے پارلیامنٹ کے قانونی اختیار و استحقاق پر شک نہیں کیا جاسکتا (پیرا 31)۔ مذکورہ ایکٹ کی ذیلی دفعات (2) الف 3 کے تحت یہ بحث اٹھی کہ متنازعہ جگہ سے متصل کسی آرا صنی کو تحویل میں لینے کا قانونی جواز ہے یا نہیں۔ جواب یہ ملا کہ:

دستور ہند کے باب بعنوان سیکولرزم کے متن کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک کے آئینی نظام سے یہ بات واضح ہے کہ اس میں عقیدہ کے امتیاز سے قطع نظر مذہب کے معاملے میں تمام افراد اور گروہوں کو مساوات کی ضمانت دی گئی ہے اور اس پر تاکید کی گئی ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے پیرا (40) اگرچہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے لیکن تمام مذاہب کا یکساں احترام حکومت پر واجب ہے۔ ایک مذہب کے مفاد کو نظر انداز کر کے دوسرے مذہب کے مفادات کی طرف داری و بیرونی نہیں کی جاسکتی (141)

متنازعہ جگہ سے قربت کے پیش نظر اس سے متصل مندر یا مذہبی عمارتیں جو بذات خود کسی خاص زمرہ میں آتی ہوں اگر انہیں تحویل میں لینے کی ضرورت پیش آئے تو یہ جائز ہے۔ پیرا (52)۔ مذکورہ ایکٹ کی ذیلی دفعات 6، 3 حصول کے مفہوم

اور اگر ایسی بات چیت کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں لگے تو وہ کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کر سکتی ہے جو حالات کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ ان حالات میں بلاشبہ دستور کے آرٹیکل 143 (1) کے تحت اختیار کردہ استصواب کی کارروائی کو موثر نم البدل نہیں تصور کیا جاسکتا ہر چند کہ قرار داد پاس کر کے زیر غور

محصل کی ہے۔ تاہم متنازعہ جگہ سے زائد آرا صنی کا مرکزی حکومت کی تحویل میں لیا جانا مطلق اور قطعی ہے۔ ایکٹ کی رو سے محصل جملہ آرا صنی کے دو حصول کے تعلق سے دفعہ 3 اور 6 میں لفظ حصول کے یہ مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں (پیرا 62)۔

جواز کے بارے میں یہ فیصلہ تعلق متنازعہ جگہ کے علاوہ آرا صنی سے ہے جو بے حدود میں ہی واقع ہے۔

مذکورہ ایکٹ کی دفعہ 6 کے حوالے سے کسی دوسرے یا اختیار فرد ادارے یا مرث کو حصول شدہ آرا صنی یا اس کے کسی حصہ کا محصل مقرر کرنے کے عمل کے جواز کے بارے میں یہ کیا گیا کہ اگر یہ معلوم ہو کہ متنازعہ جگہ کے علاوہ اس سے ملحق کسی آرا صنی کو حاصل کرنے کی جب ایک بار اجازت

بقیہ: مغربی ایشیا کا امن درہم برہم ہو جائے گا

کے لئے کام کرنا پڑے گا اس کا مطلب ہے کہ انہیں ہم بنانے اور اسرائیلی ٹھکانوں پر حملہ کرنے کی کئی فرصت ملے گی۔ لیکن حماس کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ ان کے خلاف اسرائیل کی یہ جنگ کوئی نئی نہیں ہے۔ مغربی کنارے پر رہنے والے احمد نانی ایک فلسطینی کا جس کا التماس سے تعلق ہے کہنا ہے کہ اسرائیلی پہلے بھی ہمارا پیچھا کرتے اور قتل کرتے رہے ہیں، حماس میں شامل ہونے والا ہر شخص یہ طے کر کے آتا ہے کہ اسے ایک وقت جام شہادت نوش کرنا پڑ سکتا ہے۔ احمد کا بھی کہنا ہے کہ مشادات ہر مسلمان کی تمنا ہے۔ اسرائیلیوں سے کہ دو ہم ان سے خوفزدہ نہیں ہیں ان کی دھمکیاں کو کھلی ہیں اور ہم بڑے آرام سے سوئے ہیں۔

اس صورت حال کے پیش نظر بعض اسرائیلی اور ان کے مغربی ہمنوائے ہیں کہ حماس کو پہلے تشدد سے دیا جاسکا ہے نہ آئندہ ایسا کوئی اقدام انہیں ختم کر سکتا ہے وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حماس کو امن مذاکرات سے خارج کر کے غلطی کی گئی تھی تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حماس کے ان عناصر سے ہاتھ ملایا جائے جو مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کا سیاسی حل چاہتے ہیں۔ لیکن کیا حماس کی نوجوان قیادت جو مسلح جدوجہد کر رہی ہے اپنے بعض سیاسی لیڈروں کے کسی ایسے اقدام کو برداشت کریگی یا انہیں اسکی اجازت دیگی یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ پی ایل او کے پاس مذاکرات کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ حماس چونکہ مغربی کنارے اور غزہ پٹی میں سرگرم ہے اس لئے وہ اسرائیلی ٹھکانوں پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہے اور اسے اندر و باہر کے بے شمار ہمدردوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔

جان بحق ہو گئے تھے۔ التماس بریگیڈ کے سرکردہوں کو احکام حماس کی اس لیڈر شپ کی طرف سے ملے ہیں جو مغربی کنارے اور غزہ پٹی سے باہر رہتے ہیں یعنی اردن، شام، لبنان، سوڈان اور ایران وغیرہ۔ موساد کے ایجنٹوں کو اس طرح کے لیڈروں کا پتہ لگا کر انہیں ٹھکانے لگانے کے احکام دے دیے گئے ہیں اسرائیلی افسر یہ اصرار کرتے ہیں کہ ان کے خفیہ ایجنٹوں کو اس طرح کے احکامات نہیں دیے گئے ہیں جیسے 1972 میں اسرائیل کے گیارہ ہلاکوں کو فلسطینیوں کے ذریعے قتل کر دیے جانے کے بعد دیے گئے تھے۔ اس وقت اسرائیلی حکومت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ پی ایل او کے ان سولہ کانڈروں کو جو اس کے بقول اس واقعہ کے ذمہ دار تھے دھوڑ کر ختم کر دیا جائے۔ اب سارے کانڈر اس دنیا میں نہیں رہے۔ یا تو اسرائیلیوں نے انہیں ختم کر دیا یا فلسطینیوں کی آپسی لڑائی میں وہ کام آ گئے۔

جاسکتی ہیں۔ مزید برآں حماس کے کسی بھی کارکن کی موت ہزاروں فلسطینیوں کی نگاہ میں اسے ہیرو بنا دیتی ہے۔ اس طرح اگر کوئی کارکن شہید ہو جاتا ہے تو اسکی جگہ لینے کے لئے دسوں سامنے آ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے مجتہد قسم کے اسرائیلی افسر ایسی کوئی صورت حال پیدا نہیں ہونے دینا چاہتے جس سے حماس کو فائدہ پہنچے۔

بہر حال حماس کے کارکنوں کو گرفتار کرنا یا انہیں گولیوں سے بھون دینا آسان نہیں ہو گا یہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹے ہوئے لوگ انتہائی پڑے لکھے مجتہد اور فوجی اعتبار سے تربیت یافتہ ہیں۔ پتہ لگائے جانے کے بعد وہ بزدلانہ انداز میں خود کو حوالے کرنے کے بجائے مقابلہ کرنا زیادہ پسند کریں گے۔ اسرائیلی ایجنٹوں کو اس بات کا اندازہ اس وقت خوب ہو گیا جب انہوں نے ویکس مین کو روکا کرانے کے لئے اس خفیہ ٹھکانے پر حملہ کیا جہاں اسے رکھا گیا تھا یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس پر تشدد واقعے میں ویکس مین اور ایک اسرائیلی کانڈر کے ساتھ تین فلسطینی جاں باز بھی

مذکورہ بالا ایکٹ اور استصواب ایک مذہبی فرقے کی طرف داری اور دوسرے مذہبی فرقے کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہذا اس استصواب کا مقصد غیر آئینی اور جمہوریت مخالف ہے۔ نیز یہ کہ اس استصواب سے کوئی آئینی مقصد بھی مل نہیں ہوگا۔ پیرا (154) اس صورت میں کہ اگر عدالت یہ سمجھتی ہو کہ متنازعہ جگہ پر متنازعہ عمارت کی تعمیر ہونے سے قبل وہاں کسی ہندو مندر یا عمارت کا وجود نہیں تھا پھر بھی یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہاں پر مسجد از سر تعمیر کی جائے گی پیرا (155)

اس صورت حال کے پیش نظر بعض اسرائیلی اور ان کے مغربی ہمنوائے ہیں کہ حماس کو پہلے تشدد سے دیا جاسکا ہے نہ آئندہ ایسا کوئی اقدام انہیں ختم کر سکتا ہے وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حماس کو امن مذاکرات سے خارج کر کے غلطی کی گئی تھی تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حماس کے ان عناصر سے ہاتھ ملایا جائے جو مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کا سیاسی حل چاہتے ہیں۔ لیکن کیا حماس کی نوجوان قیادت جو مسلح جدوجہد کر رہی ہے اپنے بعض سیاسی لیڈروں کے کسی ایسے اقدام کو برداشت کریگی یا انہیں اسکی اجازت دیگی یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ پی ایل او کے پاس مذاکرات کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ حماس چونکہ مغربی کنارے اور غزہ پٹی میں سرگرم ہے اس لئے وہ اسرائیلی ٹھکانوں پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہے اور اسے اندر و باہر کے بے شمار ہمدردوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔

حماس کے اندر بعض ایسے عناصر بھی ہیں جو اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات میں پی ایل او کے ہمراہ شامل ہونا چاہتے ہیں لیکن احمد جیسے فلسطینی جن کا تعلق التماس بریگیڈ سے ہے ایسی کسی بھی گفتگو کے خلاف ہیں۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ حماس کے اندر اختلافات پیدا ہو رہے ہیں دراصل کسی بھی ایسی تنظیم کے مختلف افراد سے مختلف آوازیں سننے کو ملتی ہیں جنہیں کھلے طور پر کام کرنے کی اجازت نہ ہو۔ چونکہ تحریک انتفاضہ کے بعد ہی سے حماس کے کارکن اسرائیلی ایجنٹوں اور فوج کی زد پر رہے ہیں اس لئے انہوں نے ایک حکمت عملی کے تحت خود کو مختلف چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بانٹ لیا ہے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف سیاسی سطح پر سرگرم ہیں اور مسلح سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے۔ سیاسی سطح پر سرگرم

نئے قوانین سے اسرائیلیوں کو امید ہے کہ التماس کے سرگرم کارکنوں کو اب اپنی زندگی بچانے

اس شمارے کی قیمت: تین روپے سالانہ چندہ ایک سو پچاس روپے / سو امریکی ڈالر کے از مطبوعات مسلم میڈیا ٹرسٹ پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے الفا فیسٹ پریس سے چھپوا کر دفتری نمبر 49 ابوالفضل الکلب، جامعہ نگر نئی دہلی۔ 110025 سے شائع کیا۔ فون: 6827018

اسی بات ہوا کہ سپریم کورٹ کی قانونی حوصل کی حیثیت تحویل میں لیا ہے اس لئے متنازعہ جگہ سے مذہبی عمارتیں جو انہیں تحویل میں

ہے؟ فیصلے کے اہم نکات کی تلخیص

ووٹ کی زیر ملکیت 67 ایڈز کے عمل کو درست قرار دیا گیا ہے۔ اس کاغذی کارروائی کا نگران ہر کوٹ نے اس وقت اعلیٰ کلیننگ کے ذریعہ مقام پر سرگرم کوٹ کی تہہ بونے پختہ چوتھے مہم کے پاداش میں انہیں 1 سزا اور دو ہزار روپے کیسے۔ تینوں فیصلوں کا کام طور پر سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ تحقیقات پوشیدہ نہیں کہ فیصلے دراصل باہمی رد و بدلہ کے پیشانی سالہ ال کی پالیسی کی ہی پیدوار ہوسکتی مسلمان نہ صرف

اس تاریخی مسجد میں نماز ادا کرنے کے اپنے حق سے محروم کر دیے گئے بلکہ رفتہ رفتہ ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ مسجد مندر میں تبدیل ہوتی گئی اور بالآخر مسجد کے پانچ سو سالہ تاریخی ڈھانچے کو بھی مسمار کر کے وہاں عبوری مندر کا قیام عمل میں آگیا۔ علاوہ بریں خود مرکزی حکومت اور قاضی ہندو تنظیموں کی جانب سے اسے عظیم الشان مندر میں تبدیل کرنے کی مسابقتا جدوجہد اور تیاریاں جس طرح جاری ہیں وہ بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اور یہ سب کچھ عدلیہ کی آزادی وقار اور آئین کے سیکور اور جمہوری کردار کی دہائی کے ساتھ ساتھ انجام پا رہا ہے۔

ملی نامز کے قارئین کے لئے پیش ہیں سرگرم کوٹ کے فیصلے کے بنیادی نکات اور اس کی تلخیص جس سے ہمارے قارئین خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سرگرم کوٹ کے فیصلے کے ظاہر و باطن میں کیا ہے؟ اس فیصلے کو کس کی فتح اور کس کی شکست سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟

کوئی جمل نہیں ہے جس کی رو سے اسے غیر آئینی قرار دیا جاسکتا ہے۔ پیرا (61) دستور ہند کے آرٹیکل 14 بعنوان سیکولرزم کی دفعہ 7 کے تحت یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ متنازع جگہ پر حالت قائمہ کو بحال رکھنے کے تحت دفعہ 7 میں وضاحت کردہ حکم جمہوریت مخالف یا امتیاز پسندانہ فصل تھا جو اس وضاحت کو غیر آئینی بنادیتا ہے۔ ان کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ بات

ایکٹ 33 مجریہ 1993 کے قانونی جواز کے سلسلے میں قائم کردہ اپنی رائے اور دفعہ 4 (3) کے علاوہ پورے وضعی قانون کے جواز کو برقراری کے نتیجے میں آرٹیکل 143 (1) کے تحت کیا گیا استفسار مضحکہ خیز اور غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے مذکورہ استصواب کی سماعتی صلاحیت سے متعلق دئے گئے بیانات کی صحت کی تحقیق غیر ضروری ہے۔ (پیرا 86)

دعویدار استفسار میں حاضر نہیں ہوئے ہیں۔ نہ ہی وہ کوئی ثبوت فراہم کریں گے اور نہ ہی سوال وجواب کا تبادلہ کریں گے۔ اس طرح کے اندازوں پر عدالتی رائے دینے کی حمایت نہیں کی جاسکتی اور اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ایسی کوئی رائے ایک یا دونوں فریقوں کی تنقید کا نشانہ بنے گی کہ ان کے بیانات اور ثبوتوں کو

کر کے دوسرے مذہب کے مفادات کی طرف داری و پیروی نہیں کی جاسکتی (141) اس لئے اگر ایک مذہب سے وابستہ ہندوستانی شہریوں کی اکثریت دوسرے مذہب سے وابستہ شہریوں کی عبادت گاہ پر حملہ آور یا دعویدار ہوتی ہے تو آئین کے تحت ریاست کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ امن عامہ کے تحفظ کے لئے اس عبادت گاہ کو اپنی تحویل میں لے لے۔ دستور کے آرٹیکل 35 کے تحت یہ سوال اٹھایا گیا کہ کیا مسجد پر قبضہ دستور ہند کے آرٹیکل 25 اور 26 کی وضاحتوں کے تحت حاصل حقوق کی پامالی نہیں ہے۔ اس کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی کہ بشرطیکہ تحفظ 25 اور 26 کی رو سے مسجد چرچ اور مندر جیسی عبادت گاہوں کو ریاست اقتدار اعلیٰ کی

تحفظ 25 اور 26 کی رو سے مسجد چرچ اور مندر جیسی عبادت گاہوں کو ریاست اقتدار اعلیٰ کی حیثیت سے اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ ہندوستان میں زیر عمل اسلامی شریعت کے مطابق مخالفانہ قبضہ کے ذریعہ کسی مسجد کے حق ملکیت سے محرومی ممکن ہے۔ اس خیال کے پیچھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کے مقابلے میں مسجد کو جمہوری ہندوستان میں کوئی منفرد اور خصوصی درجہ حاصل ہے اور اسے ریاست یا اقتدار اعلیٰ کے خصوصی اختیارات کی پہونچ سے دور رکھتے ہوئے ریاستی تحویل میں نہیں لیا جاسکتا۔

فیصلہ دیا گیا کہ دفعہ 48 سے آخری عدالتی فیصلہ کی شرائط کے مطابق یہ آراضی مقدسہ میں کامیاب ہونے والے فریق کے حوالے کی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے حق ملکیت کا ثبوت قانونی عدالت میں پیش کرنا چاہئے اور وہ

ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ 6 دسمبر 1992 کو مسجد کے انہدام کے ذمہ دار افراد (بعض ایسے جرائم پیشہ تھے جن کی شناخت نہیں کی جاسکتی اور اس لئے ان کو تمام تر ہندو فرقے کے برابر نہیں سمجھا جاسکتا۔ لہذا ان کی آئینیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینے کے مقصد سے بعض شریعت عناصر کی غندہ گردی کے مظاہرے کو پورے ہندو فرقے کا عمل قرار نہیں دیا جاسکتا پیرا (55)۔ مذکورہ دفعہ میں پیش کردہ روضاحت مسلم فرقے کو امتیاز جگہ پر عبادت کرنے کے حق کو ختم نہیں کرتا اور جو صورت حال

مذکورہ بالا ایکٹ اور استفسار ایک مذہبی فرقے کی طرف داری اور دوسرے مذہبی فرقے کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہذا اس استفسار کا مقصد غیر آئینی اور جمہوریت مخالف ہے۔ نیز یہ کہ اس استفسار سے کوئی آئینی مقصد بھی حل نہیں ہوتا۔ پیرا (154) اس صورت میں کہ اگر یہ عدالت یہ سمجھتی ہو کہ متنازع جگہ پر متنازع عمارت کی تعمیر ہونے سے قبل وہاں کسی ہندو مندر یا عمارت کا وجود نہیں تھا پھر بھی یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہاں پر مسجد از سر تعمیر کی جائے گی پیرا (155)

سنے اور دیکھے بغیر یہ رائے صادر کر دی گئی۔ پیرا (156) دستور ہند کے باب بعنوان سیکولرزم کے متن کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا ہے ملک کے آئینی نظام سے یہ بات واضح ہے کہ اس میں عقیدہ کے امتیاز سے قطع نظر مذہب کے معاملے میں تمام افراد اور گروہوں کو مساوات کی ضمانت دی گئی ہے اور اس پر ناگہانی کسی ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے پیرا (40)۔ اگرچہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے لیکن تمام مذاہب کا یکساں احترام حکومت پر واجب ہے۔ ایک مذہب کے مفاد کو نظر انداز

حیثیت سے اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ ہندوستان میں زیر عمل اسلامی شریعت کے مطابق مخالفانہ قبضہ کے ذریعہ کسی مسجد کے حق ملکیت سے محرومی ممکن ہے۔ اس خیال کے پیچھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کے مقابلے میں مسجد کو جمہوری ہندوستان میں کوئی منفرد اور خصوصی درجہ حاصل ہے اور اسے ریاست یا اقتدار اعلیٰ کے خصوصی اختیارات کی پہونچ سے دور رکھتے ہوئے ریاستی تحویل میں نہیں لیا جاسکتا۔



سرگرم کوٹ کو بھی مسلمانوں کے مذہبی مقامات کے تحفظ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ متنازع جگہ کو اپنی ہی کسی کلیم کشن کی موجودگی میں جے مرکزی لے اس آراضی کے کسی حکومت مقرر کرے گی اور وہ کلیم کشن اپنا ذاتی طریق کار قربت کے پیش نظر اس سے مصل مندر یا جو بذات خود کسی خاص ذمہ میں آتی ہوں اگر اس لینے کی ضرورت پیش آئے تو یہ جائز ہے۔

نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی وجہ وضع کرنے کے لئے ایہل یاسول کوٹ سے استفسار کا حق بھی نہیں دیا گیا ہے کیونکہ دفعہ 6 میں بھی ایسا

چونکہ مرکزی حکومت نے ہی قانونی محصل کی حیثیت سے متنازع جگہ کو اپنی تحویل میں لیا ہے اس لئے اس آراضی کے کسی معاوضہ کی ادائیگی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدالتی فیصلے کے درست نفاذ کی غرض سے آخری عدالتی فیصلہ کی شرائط کے مطابق یہ آراضی مقدسہ میں کامیاب ہونے والے فریق کے حوالے کی جائے گی۔

7 جنوری 1993 کو تھی اس کی مطابق یہ دفعہ حالت قائمہ کو بحال کرتی ہے پیرا (56) اس لئے سیکولرزم اور حق مساوات مذہبی آزاد کے نام پر خصوصاً کلیم کشن کا اندازہ کردہ نتیجہ حتمی ہوگا اور کچھ ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ دستور کی دفعہ 227/226 کے تحت چارہ چوٹی کی جائے۔ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر دفعہ 14 اور 8 کی وضاحتوں کو خود ساختہ اور غیر معقول سمجھا جانا چاہئے۔

دستور کے آرٹیکل 143 (1) کے تحت باہمی مسجد کی تعمیر نو سے پہلے ہندو مندر کے وجود کی تصدیق سے متعلق استصواب کی تائید کے بارے میں حسب ذیل فیصلہ لیا گیا:

روسی حکمرانوں کے درمیان۔ وہ حتمی اصلاح کی راہ سے بھٹک جانے کے نتیجے میں لینے والی ناکامیوں کے بعد خود کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ سوال: کیا اس کا امکان ہے کہ آپ عہدہ صدارت کے لئے امیدوار ہوں۔ جواب: یہ سوچنا روسی عوام کا کام ہے۔ میں اپنے ارادے ابھی ظاہر نہیں کروں گا۔ میری طرف سے عوام کو اس فیصلہ کی اجازت ہے کہ وہ ایسا چاہتے ہیں کہ نہیں۔ سوال: کیا مغرب کو روس میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی سے نام نہاد "خارج قریب" کے سیاق میں فکر مند ہونا چاہئے۔ جواب: مغرب کو کسی اور ہی بات سے فکر مند ہونا چاہئے۔ انہیں اس طرف سے تقویت لاحق ہونی چاہئے کہ کہیں سوویت یونین کی سابقہ جمہوریتیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا بند نہ کر دیں اور ان کے درمیان باہمی ربط کھین ختم نہ ہو جائے۔ سوویت یونین ہرگز دوبارہ نہیں پیدا ہوگا اور اسی طرح روسی ریاست بھی دوبارہ وجود میں نہیں آئے گی۔ لیکن معقول تعاون اقتصادی ثقافتی اور آگے چل کر دفاعی میدانوں میں باہمی تعاون ضرور ممکن ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ باوجود اس کے کہ میں اس دن کے انتظار میں ہوں

جب ایک نیا وفاق وجود میں آئے گا، ایک سوویت یونین کی تعمیر کردہ درجہ مشکل کام ہے۔ خصوصاً روس میں بعض لوگ سوچتے ہیں کہ یہ روس کی طرف سے دھمکی ہے جو جمہوریتوں کو دوبارہ ایک وحدت بنانا چاہتا ہے۔ لیکن روس میں بی لوگوں کی بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ایک نئے اتحاد کی تشکیل کے حق میں نہیں ہیں۔ نہ صرف تمام لیڈران بلکہ عوام بھی اسی انداز پر سوچ رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے وسائل بہت محدود ہیں اگر انہیں دوبارہ متحد ہو کر رہنا پڑا تو ان کے وسائل میں باقی لوگ بھی شریک ہوں گے۔ میں ذاتی طور پر ایک نئے اتحاد کو وجود پاتے ہوئے دیکھنا چاہوں گا جو یوکرین، قزاقستان اور بیلاروس پر مشتمل ہوگا۔ یوکرین کی خود مختار ملک کی حیثیت برقرار رہے گی اور اسی طرح بیلاروس اور قزاقستان کی اتحادی حیثیت بھی بحال رہے گی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر کوئی بات بھی ممکن ہے نئی جمہوریتیں بھی ٹوٹ کر الگ ہو سکتی ہیں۔

سوال: کیا روس نائٹو کا ممبر بنے گا؟ جواب: نائٹو بنیادی طور پر ایک مغربی حریر ہے اور صرف سولر ممالک کا آلہ کار ہے جب کہ یورپ میں چون ممالک ہیں۔ ایسی کوئی کوشش بہت ضروری ہے جو نائٹو کے پرانے رول کو پھر

بقیہ: الجزائر

بڑھانے کا درست حوصلہ بٹھاتا ہے۔ الجزائر میں بے محنت کی آمدنی نے ایسے کسی حوصلہ اور جذبے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی اور اس کا غیر متوقع نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام اپنے دوعرب پڑوسیوں کے مقابلے میں بڑی بدتر حالت میں ہیں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ تیل کی تجارت میں موز آئے بغیر بھی الجزائر کو ایک درپاسی نظام کی تشکیل کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد بہت سی پر اشتیاق نگاہوں کے سامنے جاری رہے گا لیکن کم از کم یہ امکان پیدا ہو چلا ہے کہ اس سمت میں کوئی کوشش سکون کے ساتھ کی جاسکے گی۔

جنوبی افریقہ سے بھڑکی اسلامی اتحاد کی نئی کرن

عربی زبان، شریعت، علم کلام، اصول فقہ، سیرت، قرآنی علوم، حدیث، دعوت و اخلاق، تقابلی ادیان، سماجی علوم اور قانون شامل ہیں۔ ذریعہ تعلیم عموماً انگریزی ہے لیکن عالمیت کے چار سالہ کورس میں تیسرے سال سے عربی زبان ذریعے تعلیم ہو جاتی ہے۔ کلچرل سرگرمیوں کا ایک قابل ستائش پہلو یہ بھی ہے کہ طلباء کے ذہن مسلکی اختلافات سے زہر آلود نہیں کیے جاتے بلکہ فکر و مطالعے کے مختلف رجحانات و انداز کی حیثیت سے انہیں پیش کر کے قرآن، سنت، فقہ اور شریعت کے گہرے مفہیم تک طلباء کو رسائی کے قابل بنایا جاتا ہے۔ انہیں مختلف مکاتب فکر کے انداز استدلال کو پرکھنا سکھایا جاتا ہے تاکہ کلچرل سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کوئی طالب علم کٹر وہابی، دیوبندی، اویسیہ یا سنی بن کر نہ رہے۔

یہ کلچرل قوم کے وسائل سے اپنی مالی ضروریات کی تکمیل اور تدریسی عملے کی کفالت کرتا ہے۔ یہ بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے کیونکہ اکثر پیشتر اس نوعیت کی کوششیں اسلام کے آفاقی تصور کے بجائے اپنے متعصبانہ نظریات کے فروغ میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے پڑھوس مطالبات کی نذر ہو جاتی ہیں۔

عین ممکن ہے کہ اقلیتی حیثیت میں رہنے والے مسلمان ہی ایک ایسے ماحول کی تخلیق میں پیش قدمی کریں جس میں اسلام کو اپنے قدیم قدس کے ساتھ بھرنے کا موقع ملے۔ اور جس دن یہ امکان حقیقت میں بدلے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلامی کلچرل آف سدرن افریقہ سے بھڑکی ہوئی شعائیں پوری امت کو روشن کر دیں گی۔

روایت میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہے کہ تجدیدی اور آخری فکر کا گلا گھونٹ دے اور نہ ہی اتنی قیاس پرست ہے کہ اسلام کے عملی مطالعے کو تنقیدی تشکیک کا ذہنی سرکس بنا کر رکھ دے۔

سارے فلسطینیوں کی آزادانہ شرکت ممکن نہ ہو۔ کیونکہ وہ ایک ایسا چاہتے ہیں جسے وہ "قوی" کہہ سکیں۔ یہ کہ یہ نسل کارپوریٹ کا انتخاب لگائے لوئے امن معاہدے کو اپنی اہل او اور اسرائیل نے اپنی اپنی مجبوریوں کے تحت ابھی تک نبھایا ہے۔ مذکورہ بالا مسئلہ بھی اپنی انہیں مجبوریوں کے پیش نظر شاید وہ حل کر لیں۔ مگر ایسی موقع پر تیار پالیسیوں سے حقیقی اور پائدار امن بہر حال قائم نہیں ہو پائے گا۔



اسلام کلچرل آف سدرن افریقہ کی شاندار عمارت۔ یہاں اسلامی علوم کے پراثر روشن ہیں۔

ممكن كوشش كى جاتى ہے۔ كلچرل كے پرسنل اور اس كى انتظامى كى كى كى اهم شخصيت شىخ سعد الله خال نے بتایا کہ اسلام کلچرل آف سدرن افریقہ کا قیام علم پرستی کے مختلف گزشتہ، موجودہ اور آئندہ دھاروں کو احترم بخشنے اور معتدل طرز عمل وضع کرنے کی حیرت انگیز کوشش ہے۔ یہ کوشش نہ

حالیہ واقعات نے ہم پر یہ انکشاف کیا ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی اقلیت میں ہیں وہاں وہ اس طرح کے چھوٹے موٹے اور فروغ اختلافات میں الجھنے کے بجائے ان سے بالاتر ہیں۔ اس کی ایک روشن مثال جنوبی افریقہ کے شریک ناون میں بعض لوگوں کی طرف سے کی گئی جرأت مندانہ اور حوصلہ افزا کوشش ہے۔ یہ کوشش اسلام کلچرل آف سدرن افریقہ (اوسا) کی شکل میں چار سال سے جاری و ساری ہے۔ اس کلچرل تعمیری منصوبہ کئی سالوں میں مکمل ہوگا جب کہ 189 طلباء پہلے ہی داخلہ لے چکے ہیں۔ مقامی لوگوں اور لڑکیوں کے علاوہ کینیا، نائیجیر، رولڈا، ملاوی، زمبابوے اور زامبیا سے آئے ہوئے طلباء کی تعداد بھی خاصی ہے۔ کلچرل کے تنظیمیں امت کے اتحاد کی صرف بات ہی نہیں کرتے بلکہ وہ عملی اپنی زندگی اور نصاب تعلیم کا حصہ بھی بناتے ہیں۔ یہاں پر مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والے اساتذہ دیکھے جاسکتے ہیں مسلکی تعمیرات اور تعصبات سے بالاتر ہو کر طلباء میں اسلام کے تئیں وسیع تر بصیرت پیدا کرنے کی ہر

پورے عالم اسلام میں بہت سی تعلیمی درس گاہیں ہیں اور ان میں بعض بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں جن میں مصر کی جامعہ ازہر سر فہرست ہے۔ اسی طرح تونس کی القرویم یونیورسٹی، شام میں دینی تعلیم کی جامعات اور کلچرل، سعودی عرب، ایران اور ہندوستان کے کئی ادارے مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تمام اداروں کے طریقہ تعلیم کا ایک مشترکہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہاں کسی مخصوص مکتب فکر کے مطابق ہی اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے ایسا

دنیا کے اسلام پر ایک سرسری نگاہ سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان ہے۔ تقریباً پچاس مسلم قومی ریاستوں کا وجود امت کے تصور کی پوری طرح نفی کر رہا ہے۔ ان ممالک کی حکومتیں وسیع تر امت کے مفادات کے بجائے اپنے قومی اغراض و مفادات سے سروکار رکھتی ہیں لیکن قومی ریاستوں کو امت کے تصور کے مساوی سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کا تصور ملک یا ریاست کے مقابلے



ایک لکچر سے ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے روائڈا کا ایک طالب علم

میں کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس تصور کا مظاہرہ مختلف شکلوں میں ہوتا ہے مثال کے طور پر بوسنیا ہرزیگوینا، کشمیر اور فلسطین میں اپنے بھائیوں کے انجام کی طرف سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو تشویش

مطابق اسلام کی تفسیر و تشریح کرنے کے علاوہ بھی ہمیں اسلام کے تعلق سے اور بہت کچھ کرنا ہے۔ بعض ادارے تو ایسے ہیں کہ اگر کسی دیگر مذاہب مسالک ان میں کسی سطح پر پڑھائے جاتے ہیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی خامیوں کو اجاگر کیا جائے اور خود اپنے مسلک کی برتری ثابت کی جائے۔ اور یہ بات بھی امت کے فکری عمل میں تفریق اور غیر ہم آہنگی کی دلیل ہے

لیکن اگر عالم اسلام کی صورت حال مایوس کن ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا اطلاق دنیا کے دیگر حصوں کے مسلمانوں پر بھی کیا جائے۔

یہ کلچرل قوم کے وسائل سے اپنی مالی ضروریات کی تکمیل اور تدریسی عملے کی کفالت کرتا ہے۔ یہ بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے کیونکہ اکثر پیشتر اس نوعیت کی کوششیں اسلام کے آفاقی تصور کے بجائے اپنے متعصبانہ نظریات کے فروغ میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے پڑھوس مطالبات کی نذر ہو جاتی ہیں۔

اور تعلق خاطر ہونا چاہیے۔ امت میں اختلاف و تفریق کا اظہار ایک اور سطح پر بھی ہوتا ہے اور وہ ہے تعلیم، خصوصاً مذہبی تعلیم

لیکن اگر عالم اسلام کی صورت حال مایوس کن ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا اطلاق دنیا کے دیگر حصوں کے مسلمانوں پر بھی کیا جائے۔

بیٹے: پائیدار امن کا ضامن

ابراہیم کے نمازیوں کو عین حالت نماز میں گولیوں سے بھن دیا تھا تو اسرائیلی فوج نے یہودیوں کی حفاظت کے لئے سخت قوانین بنائے جن کی وجہ سے جگہ جگہ چیک پوسٹ بن گئے اور عام فلسطینیوں پر دیوں پابندیاں عائد ہوئیں۔ لیکن یہودیوں کو گھومنے پھرنے کی پوری اجازت ہے۔ ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جب تک یہ صورتحال باقی رہتی ہے یعنی جس وقت تک یہودی آبادیاں وہاں قائم ہیں انھیں پر پی ایل او کا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا۔ اسرائیلی وزیر اعظم کو بھی اس کا احساس ہے اور انہوں نے کم از کم اتنا کہا ہے کہ وہ انھیں قصبے کے اندر آباد یہودیوں کو وہاں سے باہر نکال لیں گے۔

اوپر بیان کی گئی صورتحال کے پیش نظر اسرائیلی بعض ایسی تجاویز پیش کر رہے ہیں جو ستمبر 1993 میں طے پائے اصولوں کے خلاف ہیں۔ مثلاً وہ یہ کہ رہے ہیں کہ انتخابات اسرائیلی فوج کی

ضروری وضاحت

ملی ناگزیر کے 17/3/94 کے شمارے میں پروفیسر اقبال انصاری کا مضمون "ہندو مسلم تعلقات کل اور آج کے تناظر میں" دراصل انگریزی میں لکھا گیا تھا جسے ہمارے ایک محترم رفیق نے عام فہم اردو میں منتقل کیا تھا۔ مصنف نے بعض اصطلاحات کے ترجمے کے سلسلے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار فرمایا ہے اور بقول ان کے ترجمے نے بعض غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی غلط فہمی کے ازالے کے لئے مصنف سے براہ راست رابطہ فرمائیں۔

پتہ: پروفیسر اقبال انصاری 4/1703 منزل منزل، دودھ پور، علی گڑھ۔ فون: 400425 (0571)

کلنٹن اسرئیل کے دورہ مغربی ایشیا پر تازہ ترین رپورٹ

امریکی صدر کلنٹن کے دورہ مغربی ایشیا پر تازہ ترین رپورٹ

یہ بات فطری تھی کہ صدر بل کلنٹن مغربی ایشیا کا اپنا پہلا دورہ مصر سے شروع کرتے کیوں کہ اسرائیل کے ساتھ معاہدہ امن کرنے کے بعد ہی سے مصر عرب دنیا میں امریکی اور مغربی مفادات کی مسلسل حفاظت کرتا رہا ہے۔ چونکہ صدر کلنٹن اردن

وہ بارودی سرنگوں سے گھرا ہوا تھا۔ دراصل کیمپ ڈیوڈ کے کارنامے ساری بارودی سرنگوں کو ہٹا کر بنایا گیا تھا۔ پھر بھی کیمپ سے چند گز کی دوری پر ایسی بہت ساری سرنگیں موجود تھیں۔ اس

ہوئی۔ لیکن جب آخری دو ٹنگ ہوئی تو معاہدے کے حق میں 55 اور مخالفت میں 35 ووٹ پڑے۔ یہ وہی ممبران ہیں جنہوں نے ٹ کلنٹن کے اردنی پارلیمنٹ سے خطاب کا بائیکاٹ بھی کیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ خود اردن میں بھی اسرائیل کے خلاف کافی جذبات پائے جاتے ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ کسی مناسب موقع پر یہ چنگاری شعلے میں نہ تبدیل ہو جائے۔

بہر حال ان علامتی اور حقیقی خطرات کے باوجود صدر کلنٹن نے مغربی ایشیا کا دورہ جاری رکھا۔ دورے کا ایک مقصد امریکہ کی اندرونی سیاست پر اثر انداز بھی ہونا تھا جہاں سینٹ اور کانگریس کے لئے درمیانی مدت کے ضمنی انتخابات ہو رہے ہیں۔ چونکہ انتخابی مہم کے دوران یہ بات روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے کہ اندرون خانہ کلنٹن کی ناکام پالیسیوں کی وجہ سے ان کی پارٹی آئندہ انتخابات میں شکست کھا جائے گی۔ خارجی محاذ پر زبردست کامیابی کے ذریعے کلنٹن امریکی ووٹروں کو متاثر کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اور ان کے حامی دورے کی تفصیلات کو کافی براہ کرا کر پیش کر رہے ہیں۔

یوں تو کلنٹن کو کچھ ملکوں کا دورہ کرنا تھا جن میں سے پہلے یعنی مصر، سعودی عرب، کویت، اسرائیل اور فلسطین تو امریکی حلیف ہیں البتہ شام ایک ایسا ملک ہے جس کی اپنی آزادانہ پالیسی ہے اور یہیں امریکی صدر کی ذہانت اور سفارتی سوچ بوجھ کا اصل امتحان ہونا تھا۔ شام کے دورے پر جانے سے پہلے خود امریکہ میں صدر کلنٹن کے فیصلہ کو بدفہم سمجھا گیا تھا کیوں کہ شام اب بھی امریکی نقطہ نظر سے ان ممالک کی فہرست میں شامل ہے جنہیں واشنگٹن دہشت گرد قرار دیتا ہے۔ اس لئے بہت سارے ایسے لوگ جواب بھی عربوں کے خلاف معاندانہ جذبات رکھتے ہیں کلنٹن کے دورہ شام کے مخالف تھے لیکن کلنٹن نے ان ساری مخالفتوں کے باوجود شام جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اس مختصر دورے سے کوئی بڑی کامیابی تو حاصل نہ ہوگی لیکن اسرائیل اور شام کے مابین مذاکرات کو دوبارہ زندگی بخشنے میں مدد ملے گی۔ اس سوچ کے ساتھ کلنٹن دمشق پہنچے جہاں صدر حافظ الاسد نے ان کا خیر مقدم کیا لیکن بل کلنٹن کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ مغربی ایشیا کے مسائل بڑے پیچیدہ اور سنگین ہیں۔ دورے کے بعد کلنٹن نے یہ دعویٰ کیا کہ بات چیت میں پیش رفت ہوئی ہے لیکن بظاہر اس کے کہیں کوئی آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ بل کلنٹن نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ دو طرفہ مذاکرات کے دوران انہوں نے اسد سے یہ وعدہ لیا تھا کہ مشترکہ پریس کانفرنس میں وہ حماس اور اس جیسی دوسری تنظیموں کی "انتہا پسندانہ" بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسرائیلی ذمہ داران خاص طور سے اس بات سے پر امید تھے کہ کم از کم



کلنٹن حافظ الاسد کے ساتھ اسد کی سوچ بوجھ نے کلنٹن کے ہوش اڑا دیے

علامتی صورت حال کے ذریعے کیمپ ڈیوڈ داران یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ وہ جس امن معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں وہ خطرات سے گھرا ہوا ہے۔

اردن اور اسرائیل کے ذمہ داران اپنے اس تجزیے میں کافی حد تک صحیح بھی تھے کیوں کہ اسی دن جنوبی لبنان میں حزب اللہ کے جاں بازوں نے اسرائیلی فوج پر حملہ کیا مزید براں غزہ پٹی میں یاسر عرفات کی اہلیں پر ایک عام مڑتال مٹائی گئی۔ عرفات دراصل معاہدے کی اس حق کے خلاف احتجاج کر رہے تھے جن کے مطابق یروشلم میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری

کن شاہ حسین اور اسرائیلی وزیر اعظم ایٹن رابن کی دعوت پر مغربی ایشیا آئے تھے اس لئے زیادہ فطری بات یہ ہوتی کہ وہ سب سے پہلے اردن جاتے جہاں اردن اسرائیل معاہدہ امن پر دستخط ہونے کے مگر اس چیز کو نظر انداز کر کے کلنٹن پہلے مصر گئے کیونکہ امریکہ کی نظر میں حسنی مبارک ایک زیرک اور منجھے ہوئے سیاست داں ہیں۔ صدر کلنٹن سے مبارک نے تقریباً چار گھنٹے تک مختلف عرب مسائل پر گفتگو کی امریکی افسروں کا یہ عام تاثر ہے کہ اس گفتگو سے ان کے صدر کو کافی فائدہ پہنچا۔ اس موقع پر صدر کلنٹن نے یاسر عرفات کو بھی بلا بھیجا تھا۔ عرفات نے مبارک اور کلنٹن کے دباؤ میں آکر حماس کی بقول ان کے "انتہا پسندانہ سرگرمیوں کی مذمت کی۔"

اگر کلنٹن نے یہ امید باندھ رکھی تھی کہ اس دورے سے اسد کے رویے میں یکجہ آئے گی تو یقیناً انہیں مایوسی ہوئی ہوگی کیوں کہ اسد نے یہ تو تسلیم کیا کہ وہ امن چاہتے ہیں مگر ایسا امن معاہدہ نہیں جیسا کہ اردن اور پنی ایل اولنے اسرائیل کے ساتھ کیا ہے۔ اسرائیل جب تک گوللان کی پہاڑیاں اور جنوبی لبنان کا علاقہ خالی نہیں کرے گا تب تک امن معاہدہ نہیں ہوگا۔

مصر کے بعد صدر کلنٹن اردن پہنچے جہاں وادی عرب میں اسرائیل اور ان کے درمیان پہلے سے طے پائے ہوئے امن معاہدے پر بطور گواہ انہیں دستخط کرنے تھے۔ اردن اور اسرائیل کے ذمہ داروں نے اس موقع کو کافی علامتی بنا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ کیمپ جہاں صدر کلنٹن اردن اور اسرائیل کے حکمران اور دوسرے مہمانان گھمرائے گئے تھے

کا اردن کو خصوصی حق حاصل ہو جاتا ہے۔ پی ایل او کو اندیشہ ہے کہ اس حق کے ذریعے اردن یروشلم کو آزاد فلسطینی ریاست کا دار الحکومت بننے کے بجائے اسرائیل کا حصہ بنا دینا چاہتا ہے۔ اردن اسرائیل معاہدے کو دونوں ملکوں کی پارلیمنٹ سے منظوری مل گئی ہے۔ خصوصاً اردن کی پارلیمنٹ میں اس مسئلے پر زبردست بحث

ایک بار صدر اسد نے پریس کانفرنس میں "مکمل امن کے لئے مکمل انخلا" کا جملہ استعمال کیا۔ اسرائیلیوں کے نزدیک یہ بات کافی حوصلہ افزائی تھی۔ شام کے صدر حافظ الاسد اس دورے سے یہ فائدہ بھی اٹھانا چاہتے تھے کہ ان کے امریکہ سے تعلقات بہتر ہو جائیں۔ چنانچہ بڑی ہوشیاری سے



کویت کے امیر کویت کا سب سے بڑا ایوارڈ مبارک الکیبر میڈل "کلنٹن کے گلے میں ڈالتے ہوئے"

انہوں نے واشنگٹن پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا اور اصرار کیا کہ دمشق اسرائیل سے مذاکرات امریکہ کے توسط سے کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف اسرائیلی براہ راست مذاکرہ چاہتے ہیں لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ کلنٹن پر انہیں مجبور نہ ہو کہ کیوں کلنٹن کی شکل میں انہیں ایک ایسا امریکی صدر نصیب ہے جو علی الاعلان یہ کہتا ہے کہ "میں اس وقت بھی اور ہمیشہ آپ کے ساتھ کھڑا ہوں گا" امریکی صدر جب دورے سے وطن واپس ہو رہے

لیکن دوسرے بہت سارے امریکی اور اسرائیلی ذمہ داران اس دورے سے مایوس ہوئے کیونکہ انہیں اس سے زیادہ کی توقع تھی۔ اسرائیلی وزیر اعظم نے اس دورے پر یہ کلمہ بھر پور تبصرہ کیا کہ "یہی امن سازی کی بنیاد ہے صبر سے کام لیں۔"

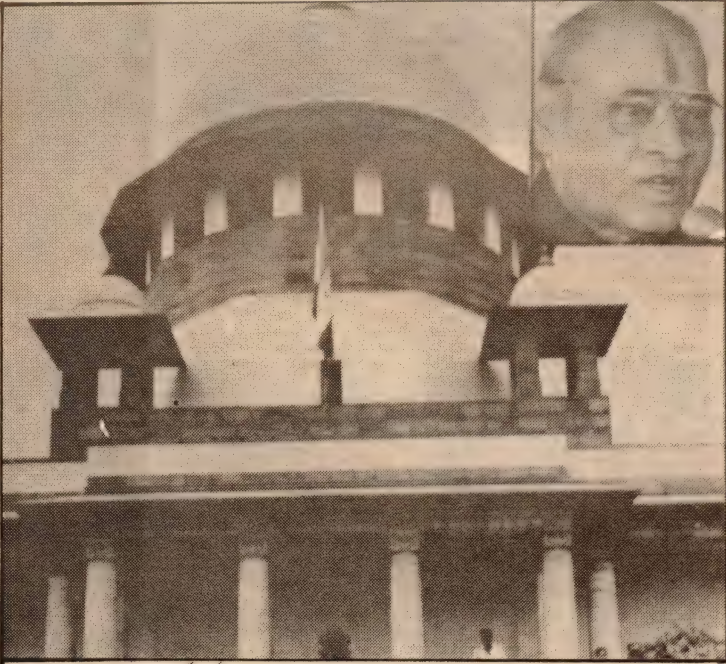
سرگرمیوں کی مذمت کریں گے۔ مگر صدر اسد نے پریس کانفرنس میں ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ بلکہ بعد میں انہوں نے یہ تک کہ دیا کہ دو طرفہ گفتگو میں دہشت گردی سرے سے زیر بحث ہی نہیں آئی۔ ظاہر ہے اسد کے اس بیان نے امریکی ذمہ داروں کے ہوش اڑا دیے چنانچہ دمشق سے واپس ہوتے ہوئے صدر کلنٹن کو پریس رپورٹوں سے بات کرتے ہوئے یہ واضح کرنا پڑا کہ صدر اسد نے تنہائی میں ان سے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ تل ابیب میں بس دھماکے میں معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔

بہر حال دونوں رہنماؤں کے درمیان گفتگو کے پیچ جو مسئلہ سب سے زیادہ زیر بحث رہا وہ گوللان اور جنوبی لبنان میں مقبوضہ علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کی واپسی سے متعلق تھا۔ صدر اسد نے یہ واضح کیا کہ جب تک اسرائیل یہ سارے عرب علاقے پورے طور پر خالی نہیں کر دیتا مکمل امن کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔ اگر کلنٹن کو یہ امید تھی کہ ان کے دورے سے اسد کے رویے میں کچھ یکجہ آئے گی تو انہیں ضرور مایوسی ہوئی ہوگی کیونکہ انہوں نے یہ تو تسلیم کیا کہ وہ امن چاہتے ہیں مگر ایسا امن معاہدہ نہیں جیسا کہ اردن اور پنی ایل اولنے اسرائیل کے ساتھ قائم کر لیا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود کلنٹن نے اپنے دورے کو کامیاب قرار دیا۔ اسرائیلی افسروں نے

دمشق میں حافظ الاسد نے کلنٹن کا خیر مقدم کیا۔ وہاں کلنٹن کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ مغربی ایشیا کے مسائل بڑے پیچیدہ اور سنگین ہیں۔ دورے کے بعد کلنٹن نے یہ دعویٰ کیا کہ بات چیت میں پیش رفت ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسد سے حماس کی سرگرمیوں کی مذمت کرنے کی بھی بات ہوئی ہے۔ مگر اسد نے پریس کانفرنس میں ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔

تھے تو بے انتہا خوشی کے ساتھ اعلان کیا کہ "مغربی ایشیا کے تنازعے سے متعلق ساری پارٹیاں امریکہ پر بہت ہی زیادہ اعتماد کرتی ہیں" چند ہفتوں بعد ہی امریکی وزیر خارجہ اس خطے کے دورے پر آنے والے ہیں اور بعض مبصرین کو یہ امید ہونے لگی ہے کہ اب کرسٹوفر کی بہ نسبت خود کلنٹن اس مسئلے پر زیادہ توجہ دے گئے۔ گویا اس دورے سے کم از کم یہ نتیجہ نکلا ہے کہ کلنٹن مغربی ایشیا کے امن مذاکرات میں بذات خود بہت زیادہ سرگرمی سے دل چسپی لیں گے۔

کیا مندر بنانے کا زعم ہمارا اور کاوش و خوش طہنڈا پر لگ گیا؟



سرپریم کورٹ (السیٹ میں) ازسہارا اولیٰ مصیبت لگے پر لگی

جائیگا۔ اس طرح و شوہندو پریشد اور بی جے پی مندر کے نیم جاں الٹو کو زندہ کر کے فرقہ وارانہ اشتعال پھیلانے اور سیاسی فائدہ اٹھانے میں سرگرم ہو جائیگی۔ پہلے چار اور پھر چھ اسمبلیوں کے انتخابات ہونے ہیں اس میں بھی وہ مندر کا ڈھیل سکتے ہیں۔ سرپریم کورٹ کا فیصلہ جتنا خوش آئند ہے فسطائی قوتوں کے ہاتھوں امن وامان کے لئے بھی اتنا ہی خطرہ بڑھ گیا ہے۔ مرکزی حکومت کے سر تو اصل ذمہ داری عائد ہوتی ہی ہے ملامت گھڑ کی بھی آزمائش کا اصل وقت آگیا ہے۔ زعمہارا اولیٰ غلط حکمت عملی نے یہ دن دکھایا کہ نہ مسجد تعمیر ہو سکی نہ مندر نہ خدا ہی ملانہ وصال صم۔

بقیہ: زعمہارا اولیٰ

ختم ہو جانے کی وجہ اسلام کی زندگی کا آخری دن بھی ہوگا اسلام کا آخری ۱۰ ہادی اور مثالی پیغام آج بھی اہم ہے اور کل بھی رہے گا۔ بیسویں صدی کے موڑ پر بھی وہ اتنا ہی شاداب، بر محل اور بامنی ہے جتنا کہ چودہ سو سال پہلے تھا۔

آخر میں ہم رشید طالب صاحب کو قدرے بے تکلفانہ اور دوستانہ مشورہ یہ دینا چاہیں گے کہ آپ نے اپنا جو نام رکھا ہے وہ "بیرون ملک" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس نام سے آپ ضرور توجہ کارہ پا لیں تاکہ کم از کم اسلام کے بچنے سے خود کو محفوظ کر لیں۔ ہمارے نزدیک آپ کی مثال اس بوڑھی لومڑی کی ہے جو کسی حادثے میں اپنی دم گنوا بیٹھی تو اپنے پورے قبیلے کو یہ باور کرانے پر تل گئی کہ خوبصورت نظر آنے کے لئے وہ بھی اپنی دین کا مقابلے میں اپنی دین پر قرار رکھنا زیادہ عزیز ہے۔

اسلام کی بقاء کے لئے تبدیلی اہم اور ضروری نہیں ہے۔ البتہ معروف قومی اور بین الاقوامی حلقوں میں رشید طالب اور ان کے ہم ذہنوں کو نمایاں رکھنے کے لئے اس قسم کا شور و غل ضروری ہے تاکہ وہ ان آنکھوں کو نظر آسکیں جو ہر وقت ایسے لوگوں کی تلاش میں ہیں جو اسلام کی جڑیں اندر ہی اندر سے کھوکھلی کر سکیں۔

(انگریزی سے ترجمہ)

یہ کام ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق مسلم و غیر مسلم دانشوروں کے مضامین کے لئے وقف ہے۔ اس میں مختلف مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ ان مضامین میں پیش کردہ نقطہ نظر سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ایڈیٹر)

تحریر: سید علی

مندروہ تعمیر کریں گے اور وہیں تعمیر کریں گے جہاں و شوہندو پریشد بنانا چاہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مندر مسجد تنازعہ میں وزیر اعظم کی حکمت عملی سے کانگریس کو سیاسی فائدہ حاصل ہوا ہے اور فسطائی پارٹیوں کو ایک حد تک سیاسی پسپائی ہوئی ہے۔ مندر کی تعمیر کا کام اپنے ذمہ لے کر انہوں نے بی جے پی کا پرکشش ایٹھو چھین لیا ہے لیکن جس جانب داری سے وہ ایک مذہبی کام کو نا انصافی کے ساتھ انجام دینا چاہتے ہیں وہ جمہوریت اور سیکولرزم کے ساتھ کھلی بے وفائی ہے۔ ان کو جانب داری کا رویہ ترک کر دینا چاہئے ورنہ یہ ملک کے لئے بڑی بری مثال ثابت ہوگی۔ سرپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے بعد ان کی ذمہ داریاں دوچند بڑھ گئی ہیں۔ ایک طرف رالیہ ٹرسٹ کے شکر اچاریوں کے غیظ و غضب کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا دوسری طرف ممنوعہ و شوہندو پریشد اور اس کے پیروار کی طرف سے مندر کی تعمیر کا تازہ دم

زعمہارا اولیٰ نے ایک خالص سیاسی اور انتظامی معاملے میں جس طرح سرپریم کورٹ کو ملوث کرنا چاہا تھا وہ فی نفسہ نہایت ناپسندیدہ اور غیر جمہوری عمل تھا۔ سرپریم کورٹ کا کام مقدمات اور تنازعات کا فیصلہ کرنا ہے نہ کہ ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں کی طرح تحقیق و تفتیش کا کام کرنا

زور توڑنا ہوگا۔ کانگریس کے اندرون خانہ بھی ابال سکتا ہے۔

سرپریم کورٹ کے فیصلوں سے اتنی راحت ملی ہے کہ مرکزی حکومت کافی الجال مندر کی تعمیر میں جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جائیگا وہ خود مندر تعمیر کر نہیں

کلیان سنگھ کا جرم ثابت ہو گیا ہے وہ سزا بھی پاچکے ہیں، اب اس کا امکان ہے کہ داعی بیرو کو لگی لگی گھمایا جائے گا۔ اور ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکا کر سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔

ایک منور نجن کا اہتمام کیا تھا تو اس میں تقریر کرتے سکتے تھے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو راحت بخش نہیں ہے۔ کلیان سنگھ کا جرم ثابت ہو گیا ہے اور وہ خواہ ایک ہی دن کی سزا پاگئے۔ یہ اس کے بعد اس کا امکان غالب ہے کہ اس داعی بیرو کو لگی لگی گھمایا جائیگا اور ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکایا

سکتی اور نہ ہی کسی کو تعمیر کرنے کی اجازت دے نہیں ہے کہ وزیر اعظم کی ایماء پر رالیہ ٹرسٹ کی تشکیل ہوتی ہے اور وزیر اعظم نے اپنے خصوصی نمائندوں کے ذریعہ شکر اچاریوں کو یقین دہانی کرائی ہے کہ تنازعہ زمین (ایودھیا) ان کے حوالہ کردی جائیگی تاکہ وہ وہاں مندر تعمیر کر سکیں۔ زعمہارا

سیاست میں مذہب اور عدالت کو ملوث کرنے میں ان کو کوئی ہتھیار نہیں محسوس ہوتی۔ عقل والوں نے ان کو بہت سمجھایا کہ جس مسئلہ کا حل وہ تلاش کر رہے ہیں اس کے لئے 143 کے بجائے 138(2) کی دفعہ کا گر ہوگی لیکن ان کا ذہن تو کسی اور رخ پر کام کر رہا ہے وہ ایسی عقل کی بات کیوں مان لیتے۔ وہ تو فیصلہ کے بجائے عدالت عالیہ سے رائے طلب کر رہے تھے۔ جس میں حسب خواہش سامنے یا نہ سامنے کی پوری دستوری گنجائش ہے۔ اب وہ سوچیں کہ کس طرح اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود پھنس گئے۔ عدالت عالیہ نے اپنے روایتی وقار کو بحال رکھتے ہوئے صدارتی ریفرنس پر غور کرنا کسر شان سمجھا اور اس کو فضول اور بیکار قرار دے کر مسرور کر دیا۔ دوسرے فیصلہ کے ذریعہ حکومت کا ہاتھ پاؤں باندھ دیا کہ وہ تحویل میں لی ہوئی زمین کسی کے حوالہ نہیں کر سکتی ہے۔ چرا کلاسے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔

وزیر اعظم کے لئے سب سے بڑی پریشان کن بات تو یہ ہوگی کہ اب وہ حکومت کے در پردہ رالیہ



کلیان سنگھ کو سزا دی گئی مگر دوسروں کو کیوں نہیں؟

ٹرسٹ کا کیا کرینگے اور سادھو سنتوں اور شکر اچاریوں کو کیا جواب دینگے۔ یہ بات ڈھکی چھپی ہونے وزیر اعظم مسجد کا نام ہی بھول گئے اور تذکرہ کیا تو اس کا کہ و شوہندو پریشد کے ہاتھوں سے مندر بنانے کا کام چھین لیا جائے گا (یعنی ہم بنائیگے)۔ پھر

انہوں نے سادھو سنتوں اور شکر اچاریوں کے ساتھ راز و نیاز کا سلسلہ شروع کیا اور بالاخر ایک عدد و شوہندو پریشد کے مقابلے میں رالیہ ٹرسٹ بنوا ڈالا۔ اس کے بعد اعلان کیا کہ حکومت کا کام مندر مسجد اور گردوارہ بنانا نہیں ہے۔ ان ساری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر اعظم یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ

24۔ اکتوبر کو ایودھیا تنازعہ سے متعلق صدارتی ریفرنس کا وہ جواب سرپریم کورٹ نے سنا دیا جس کا شدت سے انتظار تھا۔ دفعہ 143 کے تحت عدالت عالیہ سے یہ رائے طلب کی گئی تھی کہ ایودھیا میں بامی مسجد سے پہلے اس جگہ پر کوئی مندر یا ہندو عبادت گاہ تھی یا نہیں؟ سرپریم کورٹ کی پانچ رکنی آئینی بنچ نے اتفاق رائے سے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ اس پر رائے دینا عدالت کی کسر شان ہے اس طرح کے غیر ضروری اور بیکار صدارتی ریفرنس کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس طرح وہ انتظامی اور سیاسی مصیبت جس کو سرپریم کورٹ کے کاندھے پر ڈال کر مسرور زعمہارا اولیٰ نے مطمئن تھے کچھ اور نئی مصیبتوں کے ساتھ الٹ کر ان پر نازل ہو گئی ہے۔ صدارتی ریفرنس کو احترام کے ساتھ مسرور کرنے کے علاوہ سرپریم کورٹ نے دو اور فیصلے بھی سنائے ہیں ان میں ایک ایودھیا ایکٹ 1993 کے تحت سرکاری تحویل میں لی گئی زمین کے سلسلے میں ہے دوسرا توہین عدالت کے جرم میں سابق وزیر اعلیٰ یوپی کلیان سنگھ کے تعلق سے ہے۔ سرکاری تحویل میں لی گئی زمین کے سلسلے میں آئینی بنچ نے دو کے مقابلے میں تین کی اکثریت سے فیصلہ دیا ہے کہ حکومت اوقاف کی زمین کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے لیکن اس کی حیثیت صرف ریسور کی ہوگی اور جب تک زیر سماعت مقدمات کا فیصلہ نہ ہو جائے

اس وقت تک زمین کے کسی بھی حصہ کو مندر یا مسجد کی تعمیر کے لئے کسی کے حوالے نہیں کر سکتی ہے۔ کلیان سنگھ کو عدالت کے حکم کی خلاف ورزی کے جرم میں ایک دن کی علاقائی قید اور دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا بھی دیدی گئی ہے۔

سرپریم کورٹ کے ان فیصلوں کا سب سے برا اثر مسرور زعمہارا اولیٰ پر پڑیگا۔ جو جواب سننے کے لئے وہ تیار بیٹھے تھے اس کے بجائے خلاف توقع فیصلے سے ان کا سارا منصوبہ ہی الٹ پلٹ ہو گیا۔ انہوں نے خالص سیاسی اور انتظامی مسئلہ میں جس طرح عدالت کو ملوث کرنا چاہا تھا وہ فی نفسہ نہایت ناپسندیدہ اور غیر جمہوری عمل تھا۔ سرپریم کورٹ کا کام مقدمات اور تنازعات کا فیصلہ کرنا ہے نہ کہ ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں کی طرح تحقیق و تفتیش کا۔ عدالتوں کا اس سے کیا تعلق کہ مسجد کے نیچے کیا تھا، لکھا تھا کس کا تھا؟ مگر زعمہارا صاحب یہ سارا کھیل ایک خالص مقصد کے تحت کھیل رہے ہیں اس لئے

سپریم کورٹ کا فیصلہ میں قبول نہیں ملی پارلیمنٹ

تصویری اجلاس بھی منعقد کیا جا رہا ہے۔ جس میں ملک بھر سے ملی پارلیمنٹ کے اعلیٰ عہدیداران شرکت کر رہے ہیں جو درحقیقت نابینا اندام ہندوستان میں مسلمانوں کے تحفظ کے لئے نئی حکمت عملی پر غور کریں گے۔ ضرورت محسوس ہوتی تو ملی پارلیمنٹ بامدی مسجد کے مسئلے پر ایک خصوصی کمیٹی بھی تشکیل دیگی۔ اس موقع پر مختلف پارلیمانی کمیٹیاں بھی اپنے الگ الگ اجلاس کر رہی ہیں۔

ملی پارلیمنٹ کی پریس ریلیز کے مطابق چونکہ مسلمانوں کی تمام توقعات حکومت اور عدالت پر سے اٹھ چکی ہیں اس لئے اب ان کے لئے صرف ایک راہ ہے وہ ہے بین الاقوامی فورم پر اس مسئلے کا اٹھایا جانا۔ کیونکہ بامدی مسجد کا اندام اور اس جگہ پر رام مندر کی تعمیر ایک غیر دستوری عمل ہے اور رام لاکا ہر درشن آئین کا ذاتی ہے۔ ملی پارلیمنٹ نے اس معاملے کو آؤ آئی سی (تظیم اسلامی کانفرنس) اور بین الاقوامی انسانی حقوق کمیشن میں بھی اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ملی پارلیمنٹ نے آؤ آئی سی کی رکنیت کی درخواست دی ہے جس پر آؤ آئی سی کے مرکزی ہیڈ کوارٹر میں سفید کیے سے غور ہو رہا ہے۔

اس موقع پر سیاسی معاملات کی کمیٹی، اقتصادی معاملات کی کمیٹی، انسانی حقوق کمیٹی اور دعوہ کمیٹی بھی اپنے اجلاس کر رہی ہیں جو دراصل مسلمانوں کے لئے سیاسی اسٹریٹیجی، "سینٹرل بینک آف مسلم انڈیا" کے قیام، مسلمانوں پر پوری زیادتیوں اور ہندوؤں و مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج کو ختم کرنے جیسے معاملات پر غور کر رہی ہیں۔

اس اجلاس میں اس پر خاص طور سے غور کیا جائے گا کہ بامدی مسجد کے بارے میں اب کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔



پریس کانفرنس کا ایک منظر

اظہار کرے تو اس کا مقدر طویل المدتی قید و بند، حکومتی تشدد اور مٹاؤ ہے۔ پھر یہ سوال بھی انتہائی اہم ہے کہ کلیان سنگھ جی کیوں؟ یہ سچ ہے کہ مسجد ان کے دور میں منہدم ہوئی لیکن غیر قانونی وغیرہ آئینی مندر کی تشکیل تو مرکز کی نگرانی میں ہوئی پھر قانون کی خلاف ورزی کرنے والے دوسروں کو سزا کیوں نہیں؟

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے پیدا شدہ صورتحال کا جائزہ لینے اور دوسرے ملی معاملات پر غور و خوض کرنے کے لئے ملی پارلیمنٹ کی جانب سے علیحدہ میں 13 سے 19 تک ایک ہفتے کا ایک

ہے۔ بالفاظ دیگر دراصل عدالت نے یہ کہا ہے کہ چونکہ مسلمان کمزور ہیں اس لئے ان کی مسجد انہیں دوبارہ واپس نہیں دلائی جاسکتی۔ فیصلے کا یہ انداز بہت ہی سنگین ہے اور اس سے ایک سیکولر اور جمہوری ملک کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

کلیان سنگھ کو علامتی سزا دینے کے بارے میں پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ یہاں لینے اور دینے کی بات الگ الگ ہے۔ اگر کوئی ہندو فاشٹ نیا قانون کی خلاف ورزی کرے تو اس کے لئے ایک دن کی سزا ہے لیکن مسلمان اگر اپنے غم و غصے کا

سوا کچھ نہیں ہے۔ پھر وہ مسلم قائدین جو اس فیصلے کی مدح کرتے نہیں سمجھتے وہ یا تو انتہائی احمق ہیں یا مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یا پھر زرخیر راوے کے زرخیر ایجنٹ ہیں جن کا کام مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ اس فیصلے نے واضح کر دیا ہے کہ ایودھیا کی زمین سے متعلق ایکٹ یا تو ایک خاص مذہبی فرقہ کو نقصان پہنچانا ہے یا دوسرے کو فائدہ اس لئے اس ریفرنس کا مقصد سیکولرزم کے منافی اور غیر آئینی ہے۔ (فیصلہ۔ پیراگراف 154) فیصلے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عدالت نے غیر جانبدارانہ رویہ اپنایا ہے اور خود کو اس سے الگ تھلک رکھا ہے لیکن سچائی صرف اتنی ہے کہ عدالت کو یہ فیصلہ دینا تھا کہ بامدی مسجد کی جگہ پر کسی ہندو مندر کا وجود تھا یا نہیں؟ اور جیسا کہ دنیا جانتی ہے کہ کسی بھی قانونی اور تاریخی تحقیق

بامدی مسجد سے متعلق سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے سیاسی و صحافتی حلقوں میں جو ہلچل مچی تھی وہ اب بھی قائم ہے اور ہندو لیڈروں کے ساتھ ساتھ مسلم قائدین کی جانب سے بھی اس پر اپنے رد عمل کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ یہ اظہار یوں ہے کہ حالیہ فیصلہ تاریخی نوعیت کا ہے اور یہ کہ عدالت عظمیٰ نے انتہائی غیر جانبدارانہ موقف اختیار کیا ہے جو مسلمانوں کے لئے خوش آئند ہے۔ اس فیصلے کو اس لئے بلی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی ہے کہ اس کے نتیجے میں بامدی مسجد سے متعلق تمام مقدمات از سر نو زندہ ہو گئے ہیں۔ اور سپریم کورٹ نے ملکیت کے مقدمے پر بھی شنوائی کا حکم دیدیا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فیصلہ تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا مقدمہ رتی ریفرنس کو غیر ضروری اور بیکار کر واپس کر دینا۔ دوسرا اچودھیا

یہ یقین کرنا کہ سپریم کورٹ نے غیر جانبدارانہ موقف اپنایا ہے طفلانہ قیاس آرائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وہ مسلم قائدین جو اس فیصلے کی مدح کرتے نہیں سمجھتے یا تو احمق ہیں یا ان میں مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے یا پھر وہ حکومت کے زرخیر ایجنٹ ہیں جن کا کام امت مسلمہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے

ایکویٹیشن ایکٹ کو جائز قرار دینا اور تعمیر کلیان سنگھ کو علامتی سزا سنانا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی بامدی مسجد کمیٹی اور دوسرے مسلم قائدین کی جانب سے بھی اس فیصلے کی ستائش کی گئی ہے اور سپریم کورٹ کے "غیر جانبدارانہ" رویہ کی تحریف کی گئی ہے۔ پرسنل لا بورڈ کی بامدی مسجد کمیٹی کی جانب سے حکومت سے یہ اپیل بھی کی گئی ہے کہ وہ بامدی مسجد سے

متعلق تمام معاملات کو تیزی سے نمٹانے کا حکم دے۔ دوسری مسلم تنظیموں کی جانب سے بھی حالیہ فیصلے کی مدح سرائی کی گئی ہے لیکن اس سلسلے میں ملی پارلیمنٹ کا موقف تمام مسلم تنظیموں اور مسلم قائدین کے موقف سے الگ ہے۔ ملی پارلیمنٹ کے مطابق جو لوگ اس فیصلے کو غیر جانبدارانہ قرار دے رہے ہیں وہ طفلانہ قیاس آرائی سے کام لے رہے ہیں۔ اس فیصلے کی تحریف کرنے والے مسلم قائدین ملی پارلیمنٹ کی نظر میں یا تو انتہائی احمق

ہیں یا وزیر اعظم کے زرخیر غلام۔ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے پر اپنے موقف کا اظہار کرنے کے لئے گذشتہ دنوں ملی پارلیمنٹ نے دہلی کے پریس کلب آف انڈیا میں ایک پریس کانفرنس کی جی جی ملی پارلیمنٹ کے قائد جناب راشد شاؤنڈے خطاب کیا تھا۔ اس موقع پر پریس ریلیز بھی جاری کی گئی۔ پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے نے ملی پارلیمنٹ کو ایک صدمے سے دو چار کر دیا ہے۔ اس لئے کہ اس فیصلے سے اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ سپریم کورٹ کو بھی مسلمانوں کے مذہبی مقامات کے تحفظ سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ یقین کرنا کہ سپریم کورٹ نے اس مسئلے پر غیر جانبدارانہ موقف اپنایا ہے دراصل طفلانہ قیاس آرائی کے

بقیہ: حماس کو ختم کرنے کا عرفات کو حکم مگر....

جانتے ہیں کہ کس طرح اسرائیل کے خلاف جاسوسی کی جائے۔ وہ خصوصی طور سے اسرائیلی فوج اور دوسرے شہری ٹھکانوں کے بارے میں جاسوسیاں کرتے ہیں تاکہ وقت پڑنے پر ان کے خلاف کارروائی کر سکیں۔

ایک عام اندازے کے مطابق حماس کو غاذہ پٹی کے تقریباً پچاس فیصد لوگوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس طرح سیاسی سطح پر بھی حماس کافی مضبوط ہے مگر دراصل یہ اس کے فوجی کارکن ہیں جن کے سرفروشان حملوں نے فلسطینی نوجوانوں کے دل جیت لئے ہیں۔ جب حماس کے ایک جانبانے تل ابیب میں پتھر پھینکے اور جام شہادت نوش کرتے ہوئے 23 یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو وہ راتوں رات فلسطینی نوجوانوں کے لئے ایک مثالی کردار بن گئے۔ حماس اور اس کے فوجی کارکنوں کی مقبولیت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر عرفات نے راتوں رات اور کلنٹن کے کہنے پر ان کے خلاف کارروائی کی تو انہیں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

شرار ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے بہت زیادہ مربوط اور بہت خفیہ انداز میں کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسرائیلی ایجنٹ ان کا پتہ لگا کر ان کا خاتمہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وسط اکتوبر میں تل ابیب میں دھماکے کے ذریعہ دار حماس کارکن 28 سالہ یحییٰ عیاش کی زندگی اس تنظیم کے غم و غل پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ ایک انجینئر ہے اور پچھلے دو سالوں سے اسرائیلی جاسوسوں کو چمکے دیکر فوجی کارروائیوں میں مصروف ہے اسرائیلی ایجنٹ اور فوج لاکھ کوشش کے باوجود اسے گرفتار نہیں کر سکے۔

حماس کے فوجی کارکن کافی پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح خود کو اسرائیلی ایجنٹوں سے محفوظ رکھا جائے، اگر وہ مذہبی یہودیوں کو لباس پہن کر کار چلاتے ہوئے اسرائیل کے اندر دندناتے پھرتے ہیں ان کی کاروں پر داعیں بازو کے یہودیوں کا یہ نعرہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ "خود کو مسج کے لئے تیار کرو"۔ جیسے بدلنے کے ماہر ہونے کے علاوہ حماس کے فوجی کارکن یہ بھی

ہو گئے۔ حماس کے کارکن بالعموم بہت پڑھے لکھے اور سماجی حیثیت کے حامل ہیں۔

1990 میں اور اس کے بعد حماس کو اردن کی اخوان المسلمین اور افغان جہاد میں شرکت کرنے والے غازیوں کے ذریعہ تربیت ملنے لگی۔ سعودی عرب اور دوسرے خطائی ممالک کے علاوہ امریکہ و یورپ میں رہنے والے ہمدردوں سے بھی حماس کو مالی مدد ملنے لگی۔ فوجی تربیت اور مالی مدد نے حماس کو ایک زبردست تنظیم بنادیا۔ اسرائیل کے خفیہ ایجنٹ لاکھ کوشش کے باوجود اس تنظیم میں گھس پٹھمی کرنے سے ناکام رہے ہیں۔ غاذہ پٹی کی بار بار کی ناکہ بندی اور 1992 میں 400 حماس کارکنوں کو جنوبی لبنان کے ایک انتہائی سرد علاقے میں بلا وطن کر دینے جیسے غیر انسانی اقدامات بھی حماس کو ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

حماس کی فوجی ونگ میں صرف چند سوا افراد ہیں جو مختلف چھوٹی چھوٹی خود مختار ٹکڑیوں میں بے ہوشے ہیں۔ اس کے فوجی کارکن جذبہ شہادت سے

حماس 1987 کی تحریک انتفاضہ کے دوران معرض وجود میں آئی۔ یہ شیخ احمد یاسین کی اس سماجی تنظیم کا ایک حصہ ہے جو برسوں سے غاذہ پٹی میں سرگرم عمل ہے۔ یہ تنظیم اسکول، ہاسپٹل، اسپورٹنگ کلب اور اسی نوعیت کے دوسرے سماجی ادارے چلاتی تھی مگر تحریک انتفاضہ کے دوران اس نے مسلح جدوجہد کا پروگرام بنایا خصوصاً 1989 میں حماس نے اسرائیل کے خلاف کئی کامیاب مسلح حملے کئے جس کے بعد شیخ احمد یاسین کو جیل میں بند کر دیا گیا۔

بظاہر ایک معذور بزرگ مگر جوان مزہم رہنما کی گرفتاری کے بعد حماس کی قیادت نوجوان اور زیادہ سرگرم لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ ان لوگوں نے اب کھل کر اسرائیل کے خلاف حملے شروع کر دیئے۔ اسی کے ساتھ ان لوگوں نے ان فلسطینیوں کو بھی ٹھکانے لگانا شروع کر دیا جو اسرائیل کے لئے جاسوسی کر رہے تھے۔ شیخ یاسین کی گرفتاری کے بعد حماس کے وہ کارکن جو سماجی تنظیموں اور اسپورٹ کلبوں میں سرگرم تھے اس کی فوجی ونگ میں شامل

مسلمانوں کے لئے ریزرویشن غاصبوں سے حق و انصاف کا مطالبہ؟

سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ ان دنوں پورے ملک میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اس مسئلے پر سیاسی پارٹیوں سے لے کر مسلم تنظیموں اور ریاستی حکومت و مرکزی وزراء سے لے کر غیر مسلم و مسلم دانشوروں کے درمیان چھ میگوئیوں کا بازار گرم ہے۔ بعض سیاسی پارٹیاں اسے خلفاء و وٹ کے حصول کے لئے ایک گراگم ایٹھ تصور کر رہی ہیں تو بعض اسے محض مسلم پرستی کا شاخسانہ بنا رہی ہیں۔ دوسری جانب بعض مسلم تنظیمیں اور ان کے رہنما باہمی مسجد کے شہادت کے بعد اپنی کوئی وقت اور عوامی بنیاد کی بازیافت کے لئے اس مسئلے کو نچو گردان رہے ہیں۔ جن ریاستوں میں اس وقت انتخابات کی دھوم دھام ہے اور جہاں آنے والے دو تین مہینے کے اندر انتخابات ہونے والے ہیں وہاں مسلم ووٹ کی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں کو ریزرویشن کے سبز باغ دکھانے میں وہاں کی حکومتیں اور سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے میں لگن ہیں۔ بعض مرکزی وزراء کی جانب سے بھی مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پس ماندگی پر اچانک اظہار ہمدردی اور ریزرویشن کی وکالت اس بات کا کھلا اعلامیہ ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و ترقی سے زیادہ

کیا مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے تدارک کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ بار آور ثابت ہوگا؟ یا یہ مسئلہ بھی اسی نوع کا شاخسانہ بن کر رہ جائے گا جو مسلمانوں کو الجھانے کے لئے یہاں کی حکومتیں اور سیاسی جماعتیں گزشتہ نصف صدی سے اختیار کئے ہوئے ہیں؟ اور جن کا شکار ہو کر ہندوستانی مسلمان روز بروز ذلت و رسوائی اور پس ماندگی و ذوال سے ہلکتا ہوتے جا رہے ہیں۔

ان کے ووٹ کا سودا ان کی نظر میں زیادہ اہم ہے اور جس کی بندر بانٹ میں یہ تمام جماعتیں، تنظیمیں، دانشوران، حکومتیں اور رہنما بلا تخصیص خویش و بیگناہ سب مصروف ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی پس ماندگی کے تدارک کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ بار آور ثابت ہوگا؟ یا یہ بات بھی اسی نوع کا شاخسانہ بن کر رہ جائے گا جو مسلمانوں کو الجھانے کے لئے یہاں کی حکومتیں اور سیاسی جماعتیں گزشتہ نصف صدی سے اختیار کئے ہوئے ہیں؟ اور جن کا شکار ہو کر ہندوستانی مسلمان روز بروز ذلت و رسوائی اور پس ماندگی و ذوال سے ہلکتا ہوتے جا رہے ہیں۔ اس اندیشے کو تقویت ہم مچانے والے درج ذیل پہلو قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ ملک کا موجودہ نام نہاد سیکولر اور جمہوری نظام جس نے یوں تو ظاہر انتہائی طور پر اپنے تمام شہریوں کو یکساں حقوق عطا کر رکھے ہیں اور ملازمت ہو یا تعلیم کسی بھی سطح پر کسی قسم کے امتیاز کی جس میں کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں ملک نے جو بھی ترقی کی ہے اس کا سارا ثمرہ صرف ایک مخصوص فرقے کی مخصوص ذاتوں کو ملا، اور خواہ وہ بھی سیکولر ہوں یا عوامی سیکولر سرکاری ملازمتوں اور عہدوں پر تقرری کا معاملہ ہو یا تعلیم اور تکنالوجی کے میدان میں سبقت حاصل کرنے کا

معاملہ ہر شعبے پر انہیں مخصوص فرقے اور ذاتوں کے افراد کی اجارہ داری قائم رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ ہمارے نام نہاد سیکولر اور جمہوری نظام کے تحت ہی ہوتا رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ خود ہندو فرقے کی اعلیٰ ذات جس کی اجارہ داری تمام شعبے پر قائم ہے اور جس کے اندر ذات پرستی اور تعصب کا مادہ اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے کہ خود اپنے ہی فرقے کی پس ماندہ اور پچھڑی ذاتوں کا استحصال صدیوں سے کرتی آتی ہیں اور اب جب کہ پس ماندہ ذات کی جانب سے اس استحصال کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی ہیں اور وہ اپنا حق لینے پر آمادہ ہیں تو اعلیٰ ذات کی جانب سے جس قسم کا معاندانہ رویہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ وہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

وٹو ناتھ پرباش سنگھ کی حکومت نے جب منڈل کمیشن کے نفاذ کا اعادہ کیا تو بھارتیہ جنتا پارٹی اور کانگریس آئی جو کہ بنیادی طور پر اعلیٰ ذات کی نمائندگی کرنے والی سیاسی پارٹیاں ہیں ان کی جانب سے پورے ملک میں جس شورش اور خلفشار کو ہوا ریگیا اور جس طرح بلاخر دی۔ پی سنگھ کی حکومت کا جنازہ نکال کر ہی ان پارٹیوں نے چین کی سانس لی اس سے بھی ان برہمنی نظام کے ٹھیکے داروں کے عوام کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے جمہوری حقوق سے متعلق یہ سوالات غور طلب ہیں۔ کیونکہ گزشتہ نصف صدی سے اس ملک میں مسلمانوں کو جس طرح سیکولرزم اور جمہوریت کے نام پر دھوکا دیا جاتا رہا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج نہ صرف ان کی تعلیمی، معاشی اور سماجی حیثیت تقریباً صفر کے قریب پہنچ چکی ہے بلکہ ان کی مذہبی و تہذیبی شخص اور آزادی بھی خطرے میں ہے، باہمی مسجد کی شہادت اس کی



اس پس ماندگی کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا اس کا حل ریزرویشن ہے؟

ایک عبرت انگیز مثال ہے۔ جب کہ ہندوستانی مسلمانوں سیکولرزم اور جمہوریت کے اصولوں پر کاندہ ہو کر آزادی کے بعد اس ملک میں اپنی الگ سیاسی پارٹی کے قیام کی بجائے مختلف قومی پارٹیوں میں شریک ہو کر ان کا حصہ بنے۔ اور اس سے قبل کبھی انہوں نے اپنی الگ نمائندگی خواہ وہ سیاسی اداروں کی سطح پر یا سرکاری ملازمتوں کی سطح پر ہو نہیں کی تھی۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے اس روشن خیالی اور وسیع النظری کا انہیں جو صلہ ملا وہ نگاہوں کے سامنے ہے۔

لہذا یہ ضروری ہے کہ مسلمان ان مسائل پر

طرح اگر انڈسٹری اور تجارت کے میدان میں مسلمانوں کے وجود کی تلاش کی جائے تو شاید خورد بین بھی مثبت نتیجہ دے سکے۔ حتیٰ کہ پارلیمنٹ اور ریاستی قانون ساز اسمبلیوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کی شرح حد درجہ مایوس کن ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک ریاست کی مثال عبرت کے لئے کافی ہوگی اور وہ ریاست ہے مدھیہ پردیش، جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب قابل غماز ہے جب کہ وہاں کی موجودہ منجہ قانون ساز اسمبلی میں ایک بھی مسلم ممبر نہیں ہے۔ آخر وہاں مسلم نمائندگی کی ایسی عبرت انگیز صورت حال کیوں؟ جب کہ یہ ملک تو سیکولر اور جمہوری ہے اور اس حیثیت سے پارلیمنٹ سے لے کر ریاستی قانون ساز اسمبلیوں اور سرکاری وغیرہ سرکاری اداروں میں ملک کے ہر طبقے اور فرقے کی نمائندگی لازمی ہے۔ لیکن یہ سیکولرزم اور جمہوریت ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا حق دلانے میں کارگر کیوں نہیں ہے؟ کچھ نہیں تو کم از کم مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب میں تو نمائندگی عطا کرنا اس نظام کی ذمہ داری تھی۔ لیکن اس نظام نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا؟ آخر کون سی ایسی رکاوٹ رہی ہے جس کے سبب ہندوستانی مسلمان اپنے ہی ملک میں ان جمہوری حقوق سے محروم کر دئے گئے ہیں جس پر تمام شہریوں کا یکساں تصرف ہونا لازمی ہے؟

سجیدگی سے غور کریں۔ اور اپنے مسائل کے حل کے لئے متحدہ لائحہ عمل اختیار کریں۔ اور اس کے لئے لازمی ہے کہ سیاسی سطح پر اپنی قوت کو مجتمع کرنے کی سعی کریں۔ کیونکہ آج سیاسی اقتدار اور سیاسی قوت کے اظہار کے بغیر ان کے کسی مطالبے کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ آج جو بیداری کی لہر اور اپنے حقوق کے لئے جس شعور کا اظہار پس ماندہ ذاتوں کی جانب سے ہو رہا ہے۔ اس کے پیچھے ان کا وہ سیاسی اتحاد اور وہ سیاسی قوت ہی ہے جس سے اعلیٰ ذات کے ہندو طبقات خائف ہیں۔ مسلمانوں کے لئے بھی لازمی ہے کہ وہ اپنے جمہوری حقوق کے حصول اور ہر سطح پر متاسب نمائندگی کے لئے متحدہ حکمت عملی وضع کرنے کی کوشش کریں۔

گزشتہ نصف صدی سے اس ملک میں مسلمانوں کو جس طرح سیکولرزم اور جمہوریت کے نام پر دھوکا دیا جاتا رہا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ان کی تعلیمی معاشی اور سماجی حیثیت تقریباً صفر کے قریب پہنچ چکی ہے۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ مسلم مخالف قوتوں کی جانب سے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار برپا کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔ اور مسلمانوں میں بھی ذات پات کی بنیاد پر تفریق پیدا کر کے نمائندگی کے سوال کو متنازعہ اور ناقابل قبول بنانے کی کوششیں ہوں گی۔ لہذا ایسی تحریکی کوششوں پر سخت نگاہ رکھنی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایک غاصب نظام اور اس نظام کے ٹھیکے دار جن کی پوری پالیسی تعصب اور امتیاز پر مبنی ہے بھلا یہ کیوں کر گوارہ کر سکیں گے کہ اس ملک میں ہر فرقے اور طبقے کو ان کا جائز حق مل سکے۔ بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ انہوں نے جس قسم کا رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کے پیش نظر سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں نمائندگی کا مطالبہ ہو یا پارلیمنٹ اور قانون ساز ریاستی اسمبلیوں میں ان کی متاسب نمائندگی کا سوال بے حد محتاط اور دور رس حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی حکمت عملی جو ووٹ کی سیاست اور مسلم رہنماؤں کی ذاتی منفعیت کی قربان گاہ پر ملی مفاد کو قربان کرنے کی بجائے غلوں اور نیک نیتی پر مبنی ہو اور جو ملی و سیاسی اتحاد کے قیام کے ساتھ ساتھ مسلم دشمن عناصر کی سازشوں کا بھی جواب دہ رہتی ہو۔ ●●

NEZAMIA UNANI MEDICAL COLLEGE, & HOSPITAL, GAYA

Recognized by C.C.I.M. & Govt of Bihar. Affiliated to B.R. Ambedkar Bihar University Muzaffarpur



اعلان داخلہ

BUMS ہوگی کورس میں داخلہ کیلئے درخواستیں مطلوب ہیں۔ دوسرا پری طب (بی۔ بی۔ ایم۔ ایس) کورس میں داخلہ کے لئے اینڈروارڈ کی تعلیمی صلاحیت میٹرک، مولوی، عالم یا اسکے برابری پاس ہوں اور عمر یکم اکتوبر 1994 کو پندرہ سال ہونا لازمی ہے۔ دوسرا فوٹو پروفیشنل بی۔ بی۔ ایم۔ ایس سال اول میں داخلہ کے لئے اینڈروارڈ کی تعلیمی صلاحیت Biology کیساتھ انٹر میڈیٹ (10+2) پاس ہونا ضروری ہے۔ اور عمر یکم اکتوبر 1994 کو سترہ سال ہونا ضروری ہے۔ اینڈروارڈ کا اردو جاننا لازمی ہے۔ داخلہ رقم و پروفیشنل 7.12.1994 تک پرنسپل نظامیہ یونیورسٹی کے دفتر میں جمع کرانے کے نام Rs. 60/- اس آرڈر یا کراس وٹس آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیج کر دینا چاہئے۔ نام جمع کرانے کی آخری تاریخ 14.12.1994 ہے۔ مزید معلومات کے لئے جوابی لفافہ بھیج کر یا پرنسپل سے رابطہ کرتے ہوئے پتہ مل سکتے ہیں۔ داخلہ ڈسٹ وائٹ ویا حاصل شدہ ہوں پر کیا جائیگا

رابطہ کا پتہ: پرنسپل ڈاکٹر انوار الحسن چھتہ مسجد۔ گیا۔ 823 001

امریکہ اور اسٹریلیا جیسے ممالک میں

سپریم کورٹ فرضی استفسار کا جواب نہیں دیتی

اجودھیا کے معاملے میں کسی مندر کے وجود کے سوال پر صدارتی استصواب کی عبارت بذات خود متنازعہ تھی

ہر موقع پر سپریم کورٹ کی رائے کو تسلیم کیا اور اس بار بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا کرنے پر رضامند تھی۔ تاہم اجودھیا کے معاملے میں متنازعہ جگہ پر معینہ مدت کے بعد کسی مندر کے وجود کے سوال پر استصواب کی عبارت بذات خود متنازعہ تھی۔ یہ بات بھی غیر واضح تھی کہ سپریم کورٹ کے اخذ کردہ نتیجے سے خواہ وہ مثبت ہو یا منفی کون سا مقصد حاصل ہونے والا ہے۔ غالباً اپنے رول کی ادائیگی کے اسی سوال نے عدالت عظمیٰ کو استصواب کا جواب نہ دینے پر مجبور کیا۔

اگر مرکزی حکومت اس مسئلہ کا فوری عدالتی حل نکالنے میں دلچسپی رکھتی تو دستور کی دفعہ 138 کے تحت موزوں پارلیمانی قانون کے مطابق پورا تنازعہ سپریم کورٹ کے حوالے کیا جاسکتا تھا۔ یہیں بہتر اقدام ہوتا۔ مذکورہ دفعہ کی رو سے پارلیمنٹ یونین لسٹ میں شامل کسی بھی معاملہ پر عدالت عظمیٰ کے اختیارات کو وسعت دینے کی مجاز ہے۔ اس دفعہ میں یہ گنجائش بھی ہے کہ کوئی معاملہ جو صوبائی لسٹ میں شامل ہو اس پر بھی استصواب ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پارلیمنٹ مرکزی حکومت اور متعلقہ صوبائی حکومت کے مابین خصوصی معاہدے کے بعد اس سلسلے میں کوئی ضروری قانون نافذ کر دے۔ اس طرح شاید عدلیہ اور انتظامیہ دونوں اپنی ذمہ داری بہتر طریقے سے انجام دے سکتے تھے۔ (انگریزی سے ترجمہ)

بقیہ: الیکٹرانک پوسٹ مین

تقریباً ناک صورت حال تو پیدا ہونے والی نہیں ہے۔ دوسری طرف اس سائنسی نعمت نے ایک ایسی مسرت سے بھی انسان کو محروم کر دیا ہے جس کا تعلق نفسیات سے ہے مثلاً یہ کہ خط کا لٹاف کھولنے میں ایک عجیب نیا لطف آتا ہے اس خیال سے کہ اس کے اندر کیا ہوگا، کافد کی قسم، تحریر، انداز بیان وغیرہ سے مرسل الیہ لکھنے کے بارے میں اپنے تاثرات قائم کرتا ہے۔ کسی کو ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہو سکتا ہے۔ ان ٹکٹوں سے کسی ملک کی نباتات، حیوانات، عظیم شخصیتوں اور جغرافیائی خصوصیات کا بھی علم ہوتا ہے اب ایسے تجسس اور شوق کی تسکین نہ ہو پائے گی، اس نعمت سے فائدہ اٹھانے والے افراد کو بحیثیت انسان ایک خسارہ اور برداشت کرنا پڑے گا۔ پہلے تو آدمی اگر چاہے تو یہ کہہ کر صاف نکل جاتا تھا کہ کوئی اطلاع اس تک قطعاً یا بروقت نہیں پہنچتی۔ اب اس عذر کو کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ جیسے ہی کسی سرے سے ایک پیغام کی ترسیل کی ابتدا ہوتی ہے تو دوسرے ہی لمحہ متعلقہ سرے پر رکھے ہوئے اسکرین پر اس کی علامت ظاہر ہو جاتی ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی پیغام ڈاک کی طرح راستے میں ضائع یا تلف ہو گیا۔

ایک اور خالی اس طرح کے استصواب کی یہ ہے کہ اس کے تحت صادر کی گئی رائے کو بااختیار طریقے سے نافذ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ یہ صدر جمہوریہ پر واجب نہیں ہے کہ وہ اس رائے کی بنیاد پر کوئی اقدام کرے اور جہاں تک ماتحت عدالتوں کا بھی سوال ہے تو یہ رائے صرف ترقیاتی اہمیت رکھتی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی سطح بہت بلند ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ سپریم کورٹ استصواب کی شرائط کے دائرے سے باہر نہیں جا

انیرودھ بوس کی تحریر

کا واحد معاملہ ہے جس کی طرف سے سپریم کورٹ نے منہ پھیر کر دیا کہ وہ اسے شرف سماعت نہیں بخشنے گی۔

امریکہ اور آسٹریلیا جیسے ممالک میں جہاں انتظامیہ اور عدلیہ کی علاحدہ حیثیتوں کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے عدالت عظمیٰ کوئی ایسا مشورہ نہیں دیتی۔ امریکی سپریم کورٹ خود سے رجوع کیے کے سوالات کا جواب دینے سے ہمیشہ انکار کرتی رہی ہے اور اس

کورٹ سے رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ تاہم سپریم کورٹ کے مشاورتی اختیارات کا دائرہ اس دفعہ میں وسیع کر کے حقائق سے متعلق سوالات کو بھی اسی میں شامل کر دیا گیا۔

مگر آزاد ہندوستان کی آئین تاریخ میں ایودھیا پر استصواب وہ پہلا معاملہ ہے جس میں صدر نے حقائق سے متعلق ایک سوال پر سپریم کورٹ سے رائے طلب کی۔ اس سے قبل چھ مواقع ایسے آچکے تھے جب ہندوستانی وفاقی انتظامیہ کے سربراہ نے عدالت عظمیٰ کی رائے جانی چاہی۔ سارے

مسئلہ ایودھیا سے متعلق صدارتی استصواب پر کوئی رائے صادر نہ کر کے سپریم کورٹ نے ملک کے ماہرین کے درمیان ایک بار پھر یہ تنازعہ کھڑا کر دیا ہے کہ ایک ایسے دستور میں جو عدالت عظمیٰ کو انتظامیہ کے مشیر کی حیثیت دیتا ہے اس طرح کی گنجائش رکھنے کا کیا جواز ہے۔

دفعہ 143 (الف) کی رو سے صدر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسے قانون اور حقائق کے بارے میں جن کی نوعیت اور اہمیت اتنی ہو کہ ان پر سپریم کورٹ کی رائے لینا ناگزیر قرار پائے سپریم کورٹ سے رجوع کر کے اس کی رائے معلوم کر سکتا ہے۔

یہ دفعہ ایک عجیب قانونی ترکیب پر مشتمل ہے جو کسی عدالتی ادارے سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی، آزادی اور ممالک سے متعلق موجودہ تنازعات کو فیصلہ کرنے کے روایتی کردار سے انحراف کر کے اس کے بجائے عموماً ایسے فرضی سوالات کے جواب دینے میں لگ جائے اور یہ سوال اس کے سامنے ایسے اقتدار اعلیٰ کی طرف سے رکھے جائیں جو تنازعہ میں ایک فریق کا درجہ بھی کسی طرح نہیں رکھتا۔ مزید یہ کہ یہی دفعہ سپریم کورٹ کو امتیازی اختیارات بھی دیتی ہے کہ وہ اس طرح کے استصواب کو زیر غور لائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی سوال کا جواب دینے سے انکار بھی کر سکتی ہے جیسا کہ اس نے ایودھیا کے معاملے میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ معاملے میں دلچسپی رکھنے والے فریقوں کو عدالت میں حاضر ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگرچہ سپریم کورٹ عموماً تمام خواہش مند فریقوں سے سماعت کے لئے درخواستیں قبول کرتی ہے۔

دفعہ 143 کا دوسرا حصہ جو حکومت ہند اور قدیم

اجودھیا کے معاملے میں صدارتی استفسار کی عبارت متنازعہ تھی۔ یہ بات بھی غیر واضح تھی کہ سپریم کورٹ کے اخذ کردہ نتیجے سے کون سا مقصد حاصل ہونے والا ہے۔ غالباً اپنے رول کی ادائیگی کے اسی سوال نے عدالت عظمیٰ کو استصواب کا جواب نہ دینے پر مجبور کیا۔

ریاستوں کے مابین باقبل دستوری معاہدوں سے متعلق سپریم کورٹ کی طرف رجوع کیے گئے سوالوں کا جواب دینا اس کے لئے لازمی قرار دیتا ہے وہ چھبیسویں ترمیمی بل کے ذریعے "رائل پریوینٹ" کے خاتمے کے ساتھ عملاً ختم ہو گیا ہے۔

دفعہ 143 کی بنیاد پر اصل حکومت ہند کے ایکٹ 213 مجریہ 1935 پر ہے جو ہمارے دستور کا پہلا تشکیلی ماڈل یا نمونہ ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق گورنر جنرل کو عبوری اہمیت کے قانونی مسائل کو سپریم کورٹ کی پیش رو وفاقی عدالت یا فیڈرل

اگر حکومت مسئلہ کے حل میں سنجیدہ ہوتی تو دفعہ ۱۲۳ کے بجائے دفعہ ۱۳۸ کے تحت تمام مقدمات سپریم کورٹ کے حوالے کر دیتی

سکتی۔ صدارتی انتخابات سے متعلق 1974 کے استصواب میں ان شرائط میں یہ شامل تھا کہ اس وقت گجرات میں انتخاب کرانا ناممکن تھا۔ اس دعوے کو سابق بھارتیہ جن سنگھ نے چیلنج کیا تھا۔ لیکن سپریم کورٹ نے یہ کہا کہ اسے استصواب کی شرائط کی صحت کے تئیں کوئی اختیار نہیں اور اس کی پابندی سے تسلیم کرنی ہوگی۔

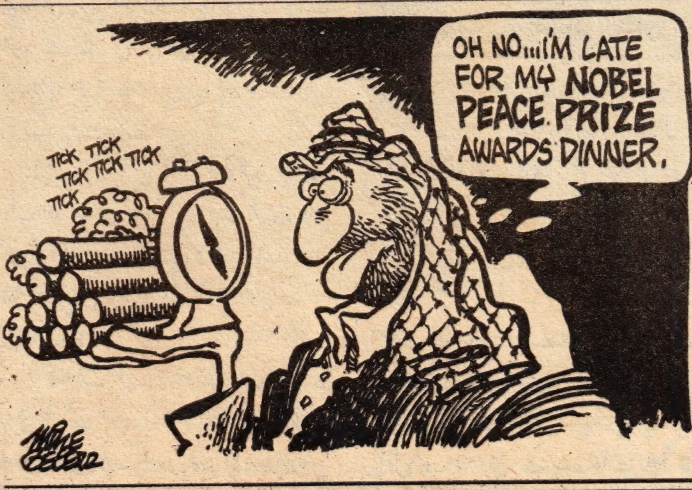
بیشتر سابقہ معاملات میں عوامی اہمیت کے کسی مسئلہ پر نزاع کو ختم کرنے کے لئے سپریم کورٹ کے مشاورتی اختیارات کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے استفادہ کیا گیا ہے اور وہی کام ایودھیا کے معاملے میں بھی ہوا۔ حکومت نے بھی

کے پیچھے یہی یقین کار فرما ہے کہ یہ عدالت کی ذمہ داری یا کام نہیں ہے کہ فرضی استفسارات کا جواب دیتی رہے اور یہ کہ ایسے معاملات پر کوئی خیال ظاہر کرنا عدالت کا کام نہیں ہے۔ آسٹریلیائی ہائیکورٹ اور جاپان کی سپریم کورٹ بھی اسی اصول پر کاربند ہیں۔

مشاورتی دائرہ اختیار کے نکتہ پس قانون کی ایسی کسی مدعی مخالفت کر کے انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان خط فاصل کو دھندلا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک معاملے میں برطانیہ کی جوڈیشل کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ایسے حالات میں صادر کی گئی ہر رائے قانونی افسران کی رائے سے زیادہ اثر رکھتی۔"



بل کلنٹن کا بین الاقوامی رول اور یاسر عرفات کا نوبل امن انعام ایک مغربی کارٹونسٹ کی نظر میں



ترقی یافتہ مواصلاتی ذرائع کے طفیل میں

بازار آپ کے دروازے پر

ترقی یافتہ مواصلاتی ذرائع نے وقت اور فاصلے کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے حیات کی سرگرمیوں میں انسانی باتوں کی شرکت کو کس قدر محدود کر دیا ہے یہ سب پر عیاں ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ بعض لوگ اس وقت کے تصور سے سمجھتے ہیں کہ جب شاپنگ جو معمولی مالک میں چند پچی پچی ساجی سرگرمیوں میں رہ گئی ہے وہ بھی ایسے بے رونق تجربے کی شکل اختیار کر لے جس میں انسانوں کا کوئی حصہ نہ ہو۔ انٹرنیٹ ہوم بیڈ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انٹرنیٹ ہوم بیڈ شاپنگ کے باتوں بازاروں اور سڑکوں کی ویرانی و بے رونقی کے اندیشے قبل از وقت اور غلط اندازوں پر مبنی ہیں اور اس طریقہ خریداری کو وجود میں آنے میں ابھی خاصا وقت لگے گا۔ اس سے پہلے کہ اسے پوری طرح فروغ حاصل ہو بہت سی باتیں ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ چند سال کی عمر سے زائد افراد میں سے ایسے بہت کم ہیں جو تفریح طبع کے سوا کسی اور مقصد کے لئے ٹیلی ویژن

ہے کہ اگر کسی کو امرود سیب خریدنا ہے تو اسکرین پر اس کی تصویر یا کسی کی بیان کردہ صفات پر اعتماد کرنے سے زیادہ صرف اپنے براہ راست نظر آنے والے تجربہ پر مجبور کرے گا۔

یہی وہ عوامل ہیں جن کی بناء پر الیکٹرونک خوردہ فروشی کے فروغ میں رکاوٹ اور تاخیر واقع ہو سکتی ہے تاہم اس کو بالکل روکا نہیں جاسکتا اس لئے کہ اس ضمن میں اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صارفین اس طریقہ کار کو کیوں اختیار کریں گے۔

صارفان ذہنیت تو یہ کہتی ہے کہ اس کی مقبولیت اسی صورت میں ممکن ہے جب دوسرے اسٹوروں کے مقابلے میں یہ لوگوں کو بعض سولتیں یا مراعات فراہم کرے۔ ان سولتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ خصوصاً سبزی، ۲۰ اور دیگر استعمال کی اشیاء اور محفوظ اشیاء خوردنی کی ہر شے خریداری کے آگاہی دینے والے عمل سے راحت ملتی ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ آج بھی کوئی کی طرف سے محتاط صارفین ہوم ڈیلیوری کے عوض چند روپے زیادہ خرچ کرنے کو ترجیح دیتے ہوں۔ بہر حال انٹرنیٹ شاپنگ کا تصور اگر پوری طرح حقیقت میں بدل گیا تو صارفین کے حق میں بہت بہتر ہوگا لیکن خوردہ فروشیوں کے سامنے ایک بڑا چیلنج ٹھہر جائے گا۔ انٹرنیٹ شاپنگ کے طریقہ کار کو صارفین میں مقبول بنانے کے لئے بازار کے نرخ اور مسابقی

شرح پر بال بچنے کے طریقوں کی طرف سے کافی ہوشیار رہنا ہوگا۔ اس میں عام اسٹوروں کے مقابلے میں سستے داموں پر معیاری، صاف ستھری اور پائیدار اشیاء کو فروخت کرنے کی صلاحیت کو بڑی

اہمیت حاصل ہوگی۔ اس پر براہ نظر رکھنی ہوگی کہ سامان سستا بننے کی دمن میں غیر معیاری چیزیں تو صارفین تک نہیں پہنچ رہی ہیں جو آئندہ کسی کمپنی کی سکہ کو متاثر کرے اور اسے دیگر قانونی دشواریوں کا

توقع ہے کہ 2005 تک لوگوں کو شاپنگ کے لئے گھر سے نکلتا نہیں پڑے گا۔ لوگ اپنے ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر ماؤس کی مدد سے عام استعمال کی اشیاء طلب فرمائیں گے اور ناپسندیدہ چیزوں کو فہرست سے خارج کر دیں گے۔ متعلقہ اسٹور سے ساری چیزیں ایک گھنٹے کے اندر اندر رہائش گاہ پر پہنچ جائیں گی۔

ہنگی کے لئے باہر نکلتا چھوڑ دیں گے۔ پہلے جو لوگ ہر شے ہاتھوں میں پھیلے ہوئے سپر بازاروں کی بھیڑ بھاڑ میں مصروف نظر آتے تھے وہ آج بھی اسی طرح گھروں سے نکلیں گے۔ ہاں ان کا مقصد کچھ اور ہوگا مثلاً ہوا خوری اور ملاقات۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہی وقت وہ اس طرح گذاریں کہ کسی ماہر دزدی، قصاب یا ستار کے پاس گذاریں جن کی خدمت ان کے لئے ہی مخصوص ہوں۔ ایسے لوگوں کی دوکانوں کو بہر حال میں چھٹکانی ہے خواہ ان

کچھ لوگوں کو خدشہ ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو ڈیپارٹمنٹل اسٹوروں کے سامنے قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کے لئے خوش گپیوں کا لطف جاتا رہے گا۔ امیر تو اپنے قلعہ نما مکانوں میں بند ہو کر رہ جائیں گے۔ خوش حال لوگ سڑکوں پر سے غائب ہو جائیں گے اور چاروں طرف مفلس و نادار ہی گھومتے ہوئے نظر آئیں گے۔

استعمال کرتے ہوں۔ ٹیلی ویژن کو انٹرنیٹ بنانے کے لئے درکار "سیٹ ٹاپ باکس" کے سستے ہونے کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ ایک نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے کہ شاید صارفین شاپنگ کے روایتی طریقے سے دست بردار نہ ہونا چاہیں جس میں اشیاء کی اچھی طرح جانچ پڑتال، مول بھاؤ کرنے، ہلانے جلانے یا سونٹنے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ان کی خصوصیات کے تصور پر ہی اکتفا کیا جائے۔ وجہ یہ

شاپنگ کا فروغ اسی صورت حال کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ڈیپارٹمنٹل اسٹوروں کی "چیک آؤٹ" قطار میں کھڑے ہوئے لئے جلتے والوں سے خوش گپیوں کا لطف جاتا رہے گا۔ امیر تو اپنے قلعہ نما مکانوں میں بند ہو کر رہ جائیں گے۔ خوش حال لوگ سڑکوں پر سے غائب ہو جائیں گے اور چاروں طرف مفلس و نادار ہی گھومتے دکھائی دیں گے۔ سیراکیٹ سے ملحق کلر پارکنگ کے میدان خس و خاشاک کا جنگل بن جائیں گے۔

توقع ہے کہ سن 2005 تک لوگوں کو شاپنگ کے لئے گھر سے باہر قدم نہ رکھنا پڑے گا۔ آپ اپنے ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر ماؤس کی مدد سے عام استعمال کی اشیاء کی فہرست طلب کریں۔ جب وہ سامنے آجائے تو اس میں سے بعض اشیاء جو اس سے قبل آپ کو پسند نہیں آتی تھیں یا وہ بد ذائقہ تھیں انہیں خارج بھی کر دیجئے۔ کوئی نئی چیز نظر آئے تو اسے شامل فہرست کر لیں۔ بلکہ اس کی بھی گنجائش ہے کہ اگر آپ کیلایا کوئی دیگر پھل ادھ کچا ہی لینا چاہتے ہوں تو اس سے متعلق وضاحتی نوٹ بھی دے دیجئے۔ متعلقہ اسٹور سے یہ ساری چیزیں ایک گھنٹے کے اندر آپ کی رہائش گاہ پر پہنچا دی جائیں گی۔

اب بعض دوسرے سامانوں کی خریداری کی طرف آئیے۔ فرض کیجئے آپ کو ویکوم کلینر خریدنا ہے۔ اسکرین پر فہرست طلب کرنے پر ویکوم کلینر کی ایک درجن اقسام مع ضروری تفصیلات کے آپ کے سامنے کر دی جائیں گی۔ مثلاً آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ لیزر کنٹرول سے چلتے والا ہے اور یہ کہ اس کی قیمت شہر کے عام اسٹوروں میں بکنے والے ویکوم کلینر سے کتنے فیصد کم ہے۔ اس کے بعد دوسری فہرست طلب کریں گے آپ جنس پتلون اور موزے وغیرہ بھی اپنے پسندیدہ رنگوں میں لے سکتے ہیں۔

ملٹی میڈیا کے پرستاروں کے ذہن میں شاپنگ کے مستقبل کا کچھ ایسا ہی نقشہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آئندہ دس سال کے عرصے میں امریکہ میں ایک طرف انٹرنیٹ ہوم بیڈ شاپنگ سے فروخت میں ہر سال تین بلین ڈالر کا اضافہ ہوگا تو دوسری طرف انتظامی اخراجات سے پریشان خوردہ فروشیوں کا دیوالیہ نکل جائے گا۔

برق رفتار الیکٹرانک پوسٹ میں

اب آپ دنیا کے کئی حصوں میں اپنے گاہکوں تک وقت رابطہ قائم کر سکتے ہیں

مواصلاتی دنیا میں جمع کردہ معلومات کو تیزی اور پوری مہارت سے دوسرے سرے تک منتقل کرنا ہی کمپنی کی کلید ہے۔ اور غالباً اس کا اطلاق تجارت اور لین دین کے میدان میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تجارتی ادارے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب کو اپنے گاہکوں اور صارفین کی ضرورتوں، شکایات اور بازار میں دستیاب مواقع سب کی طرف بیک وقت متوجہ رہنا پڑتا ہے۔ تاہم کوئی بھی نظام سہولت، رفتار راز داری اور بچت کے اعتبار سے متوقع معیار پر پورا نہیں اترتا۔ ابھی حال ہی میں ایک ایسی چیز جو افراد کے درمیان ذاتی ترسیل کے مقصد سے بنائی گئی تھی آج تجارتی مواصلات کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہو رہی ہے جسے ہم الیکٹرونک میل کے نام سے جانتے ہیں۔

آفس آؤ مشین سسٹم لوکل ایریا نیٹ ورک اور پرسنل کمپیوٹر پر انحصار کرنے والی کمپنیوں کو ہمیشہ اس دشواری کا سامنا رہا ہے کہ وہ مقامی اور بیرونی شرکا، اور دیگر متعلق لوگوں سے کس طرح بہتر رابطہ قائم رکھیں۔ الیکٹرونک میل کے نظام میں ایک خوش آئند تبدیلی آئی ہے جس سے اس کے موثر استعمال کی راہ میں حائل رکاوٹ کو دور کر دیا گیا ہے اور اس

سے استفادہ کرنے والے تمام لوگ آپس میں معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ عالمی الیکٹرونک ترسیل خدمات جی ای ایم ایس 400 نے اب یہ کام آسان کر دیا ہے اب چاہے اسے لوکل ایریا نیٹ ورک یا مانی اور میں فریم ورک کمپیوٹر تک محدود رکھیں، ہر شخص کی رسائی اس سہولت تک ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بارڈر میں اضافی سرمایہ لگانے بغیر

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیس 400 کی بدولت ایک انکلی کے اشارے پر دنیا کے ایک سو چالیس ملک میں بیک وقت ہزاروں افراد سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس کی بدولت انسان خود بھی روبوٹ بن کر رہ جائے گا جو راستہ دل کی وی اسکرین کے سامنے بیٹھ کر اطلاعات موصول کرتا رہے گا۔

کوئی کمپنی اپنی پیداوار اور آمدنی دونوں میں اضافہ کر سکتی ہے۔ انہیں یہ آسانی بھی حاصل ہے کہ اپنی موجودہ مشینوں کو ہی عالمی ترسیل نظام میں تبدیل کر لیں اور کوئی شخص اپنی مزے سے بنے بغیر الیکٹرونک میل۔ فیکس یا ٹیلیکس پیغام بھیج اور وصول کر سکتا۔ موجودہ مشینوں اور جیس 400 کے مشترک استعمال سے سافٹ ویئر کے استعمال کرنے والے لوگ دنیا میں کہیں بھی اپنے گاہکوں، ذیلی شاخوں، تقسیم کاروں، خوردہ فروشوں، سپلائروں، پروجیکٹ میوں اور سیلز دفاتر سے بیک وقت رابطہ قائم

کر سکتے ہیں۔ اس سسٹم کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جیسا کہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ہمارے مواصلاتی وسائل موجودہ تجارتی ضروریات کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے اور اس ایجاد نے گویا مضبوط اور منافع بخش تجارت کے لئے راہ ہموار کر دی ہے۔ اب کوئی تاجر نہ صرف زیادہ اعتماد کے ساتھ خرید و

فروخت کے معاملات کا فیصلہ کر سکتا ہے بلکہ بازار کا مزاج بدلنے سے پہلے مسابقت کا رخ پہچان کر اپنی حکمت عملی میں تبدیلی بھی لاسکتا ہے۔ جب کہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ بازار کی صورت حال سے متعلق اطلاع تاخیر سے وصول ہونے کی بنیاد پر کافی نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔

جیس 400 کی مدد سے الیکٹرونک میل اور 2 Asc کی فائلوں کا تبادلہ بھی ممکن ہے اس کے تحت کوئی شخص اپنے کمپیوٹر ٹرمینل پر اطلاعات وصول کر سکتا ہے اور وہاں سے انہیں دنیا بھر میں

بھیجے ہوئے سرے لاکھ ٹیلیس داروں تک منتقل کر سکتا ہے۔ اسی طرح پرسنل کمپیوٹر ٹرمینل کے ذریعے بھی بیلاس فیکس مشینوں کو پیغامات دے جاسکتے ہیں اور اگر ضروری سمجھا گیا تو پیغام کی ترسیل کے دیگر پہلوؤں کو بہتر بنایا جائے گا مثلاً یہ کہ نفاذی کا پیغام کس وقت مطلوبہ منزل پر پہنچا یا گیا۔ ہر طرح کے پرسنل کمپیوٹر، ٹرمینل، ورڈ پروسر، ٹیلیکس مشین اور الیکٹرونک ٹائپ رائٹر کو جیس 400 سے مربوط کیا جاسکتا ہے جس کے لئے بنیادی لوازم صرف پی سی ٹرمینل، ترسیل سافٹ ویئر اور ایک معیاری موڈم ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیس 400 کی بدولت ایک انکلی کے اشارے پر دنیا کے ایک سو چالیس ملک میں بیک وقت ہزاروں افراد سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس کی بدولت انسان خود بھی روبوٹ بن کر رہ جائے گا جو راستہ دل کی وی اسکرین کے سامنے بیٹھا اطلاعات وصول کرتا رہے۔ پہلے تو ڈاک کی ڈیلیوری کے مقررہ اوقات ہوتے تھے لیکن اب یہ عمل ہر وقت جاری رہے گا اور ایسے ہی یہ دیکھنے کی ضرورت ہر وقت پیش آئے گی کہ کہیں کوئی (باقی صفحہ پر)

خلج فارس کی جغرافیائی معاشی اور فوجی اہمیت

ایران کے اسلامی انقلاب کے اثرات و نتائج کا بھرپور جائزہ

خلج فارس کی جغرافیائی، فوجی، معاشی اور سیاسی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے۔ لیکن 1990 کی دہائی میں اسکی فوجی و سیاسی اہمیت خصوصی طور سے اجاگر ہو کر سامنے آئی۔ ایک دنیا کی توجہ اس علاقے کی بدلتی ہوئی صورت حال پر مرکوز رہتی ہے۔ اور جب تک ترقی یافتہ ممالک خصوصاً جاپان اور مغربی یورپ کا خلج فارس پر تیل کے لئے انحصار باقی رہے گا اس وقت تک

نادر انتصار کا مضمون "خلج فارس میں غیر اشتعال انگیز دفاع" بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انکے خیال میں علاقے کے ایک جنگی اکھاڑا بن جانے کی وجہ سے اس میں واقع اہم ممالک جیسے ایران، عراق اور سعودی عرب میں سیاسی غیر یقینی کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ انتصار نے مصر کو بھی اس علاقے میں جنگ جوہانہ ماحول کو فروغ دینے کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے۔

یہ علاقہ ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بھی بن رہا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو سمجھنے بغیر بین الاقوامی سیاست و تعلقات میں خلج فارس کی فوجی و سیاسی اہمیت کو سمجھنا مشکل ہوگا۔ زیر تبصرہ کتاب میں اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ خلج فارس میں کسی بھی سیکورٹی نظام یا انتظام میں ایران کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

زیر تبصرہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا باب خلج فارس میں کشیدگی سے بحث کرتا ہے۔ دوسرا باب اسکے سیاسی و معاشی پہلو سے متعلق ہے۔ تیسرا باب اسلام اور انقلاب کے بارے میں ہے۔ اور چوتھا حصہ اسلامی انقلاب کے بعد ایران میں معاشی تباہی و نابرابری سے بحث کرتا ہے جبکہ پانچواں اور آخری حصہ ایران و عرب دنیا اور ایران اور سپر پاور کے بارے میں ہے۔ ان کے علاوہ کتاب میں جنگ کے معاشی نقصانات اور ایران، عراق اور سعودی عرب کے فوجی اخراجات سے متعلق اعداد و شمار بھی شائع کئے گئے ہیں۔

انکی کئی معروف ماہر ایران میں جن کے خیالات سے بہت سے لوگ اتفاق نہیں کرتے۔ اپنے مضمون "ایران انقلابی کیوں رہا ہے" میں انہوں نے ایران کے 1979ء کے انقلاب کے اسباب و عوامل سے بحث کی ہے۔ ان کے نقطہ نظر سے تین عوامل خصوصی طور سے قابل توجہ ہیں۔ شیعہ علماء کا رول، اسلام سے قبل ثقافتی ورثے سے شغف اور ایران میں خارجی طاقتوں کا رول۔ ان عوامل نے کئی کے بقول انقلاب ایران میں اہم رول ادا کیا تھا۔

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

لوگ انہیں گھٹا کر پیش کرتے ہیں۔ اعداد و شمار کی ٹیلوں کے ذریعہ ہوشنگ نے ایک صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی سعی کی ہے۔ اسی کے ساتھ ہوشنگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اکثر لوگ ماحولیات کو پہونچنے والے نقصانات یا نتائج کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا پھر ایران نے شام کو بطور تحفہ جو تیل دیا یا خلج فارس میں جنگی خطرے کی وجہ سے تیل کے ٹینکروں کو طویل راستوں سے بھیجنے اور ان کی انشورنس جو پر زائد اخراجات آئے، انہیں بھی بالعموم لوگ اپنے مطالعہ میں شامل نہیں کرتے۔

نادر انتصار کا مضمون "خلج فارس میں غیر اشتعال انگیز دفاع" بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انتصار کے خیال میں علاقے کے ایک جنگی اکھاڑہ بن جانے کی وجہ سے اس میں واقع اہم ممالک جیسے ایران، عراق اور سعودی عرب میں سیاسی غیر یقینی کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انتصار نے مصر کو بھی اس علاقے میں جنگجوہانہ ماحول کو فروغ دینے کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ انتصار کہتے ہیں کہ خلج فارس کے علاقے میں کسی بھی دفاعی انتظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خاموش کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنگی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت

اسلام میں زائد مال کا مصرف

خریج کو فکر اسلامی کی رو سے صارفانہ، منفعتی اور اجتماعی زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں پہلی نوع کا خریج مؤخر الذکر دو پر مقدم ہے جن کا تعلق عفو یا بچت سے ہے۔ صارفانہ اتفاق کی تکمیل کے بعد ہی بقیہ دو زمروں کا حوالہ آتا ہے۔ منفعتی اتفاق کا مقصد سرمائے کی تشکیل اور افراد کی آمدنی بڑھانا ہے اور اتفاق اجتماعی سے مراد فہام میں ہر مسلمان کی شرکت و مسامتہ ہے جسکی ادنی صورت زکوٰۃ کی ادائیگی ہے جس کے لئے صاحب نصاب ہونا شرط ہے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

اس سلسلہ میں خیر کے تین زمرے قائم کئے گئے ہیں: انسانی صلاحیتوں کے ذریعے مادی وسائل کے ذریعے اور نقد روپے کے ذریعے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

نام کتاب: اتفاق العفو فی الاسلام
مصنف: ڈاکٹر یوسف ابراہیم کلید شریعہ قطر
یونیورسٹی
ناشر: وزارت الاوقاف والشؤون الاسلامیہ، قطر

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہ نہ رہتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔



کر سوڈان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم کر لی۔ ابھی دنیا سے خلافت کے خاتمے کو پون صدی بھی نہیں گزری ہے، مسلمانوں کا زوال اور ان کی سیاسی بے بسی کوئی بہت زیادہ پرانا عمل نہیں ہے۔ لیکن زوال کے اس مختصر عرصے میں پوری دنیا میں اسلام کے عالمی غلبے کے لئے مختلف قسم کی بے شمار تحریکیں چل رہی ہیں، ہنگامے برپا ہیں اور اسلام کو غالب دیکھنے کے آرزو مند مسلم انقلابی دنیا کے مختلف خطے میں اپنی جانیں لٹا رہے ہیں۔ گویا رفتہ رفتہ پھر یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ اسلام دوبارہ دنیا کی عظیم ترین قوت بننے کے لئے بے چین ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث میں دنیا کے خاتمے سے قبل اسلام کے عالمی غلبے کے لئے واضح اشارات موجود ہیں، گو کہ محدثین کے درمیان یہ بات اختلاف کا باعث رہی ہے کہ مہدی سے متعلق احادیث کو یا حضرت مسیح کی آمد سے متعلق اشارات کو خالص لفظی طور پر لینا چاہئے یا استعاراتی انداز سے؟ بعض مفکرین اسلام کے نزدیک مہدی کا ظہور کسی طلسماتی یا معجزاتی پس منظر کے بجائے خالص واقعاتی پس منظر میں ہوگا اور اس کے کارناموں کے تجزیے کے بعد ہی لوگ اس کی اصل حیثیت متعین کر پائیں گے۔ لیکن بعض مفکرین ان اشارات اور پیش گوئیوں کو تاریخ کی واضح پیش گوئی شمار کرتے ہیں اور وہ حادثات و اتفاقات کو ان احادیث کی روشنی میں مرتب کر کے مستقبل کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتے ہیں۔ (تفصیلات اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں)

کیا مسیح دجال کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا ہے؟ اسلام کی عالمی سیاسی قوت کے خاتمے کے بعد یہ سوال اکثر مسلم ذہنوں میں شدت کے ساتھ اٹھتا رہا ہے کہ مسیح دوبارہ نہ سہ سے اسلام کے قیام کے لئے مسیح موعود کی آمد کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے دوبارہ ظہور کا انتظار ایک مدت سے عیسائی دنیا کر رہی ہے۔ شیعہ روایتوں میں امام غائب کا انتظار یا پھر جمہور اہل سنت کا یہ ماننا کہ قرب قیامت میں ایک بار پھر اسلامی نظام پوری دنیا پر قائم ہو جائے گا اور اس کام کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دنیا میں تشریف لائیں گے۔ لیکن ان کے ظہور سے پہلے ایک چھوٹے مسیح کا ظہور ہوگا جو بالآخر حضرت مسیح کے ہاتھوں لد کے مقام پر مارا جائے گا۔ اسلام کی سیاسی قوت کے زوال کے ایام میں ہی علماء اور محدثین نے ظہور مہدی اور ظہور مسیح کے سلسلے میں پائی جانے والی احادیث اور روایتوں کا مطالعہ کیا اور ان میں سے بعض تو ان روایتوں کا سہارا لے کر خود ہی مہدی موعود یا قطب وقت بن گئے۔ مثال کے طور پر سوڈان میں مہدی سوڈانی کا ظہور یا ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کا خود کو قطب گردانا اسی سلسلے کی کڑی ہیں، یہ حضرات اسلام کے سیاسی زوال سے سخت مضطرب تھے اور ان روایتوں کا سہارا لے کر ایک مرکزی اسلامی سیاسی قوت کا احیاء چاہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کو اس بارے میں بہت زیادہ عملی کامیابی نہیں ملی البتہ سوڈان کے مہدی نے برطانوی سامراج کے عین عالم شباب میں اسے شکست دے